اذان

اور

دوسرے افسانے

جیلانی بی اے

اذان

اور دوسرے افسانے

جیلانی بی اے

مکتبہ چراغِ راہ

۹۔ لوٹیا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی ۱

قیمت:- تین روپے

بار اوّل ۱۹۵۴ء
ناشر مکتبہ چراغ راہ۔ کراچی
مطبع مشہور آفسٹ پریس کراچی

ترتیب

اذان

میں ایک لمبی مدت تک جگہ جگہ پھرتا رہا اس تلاش میں کہ شاید کوئی ایسا اللہ کا بندہ مل جائے، جو مجھے اذان کہنا سکھا دے۔ ایسی اذان جو نیند کے ماتوں کو جگا دے۔ اور قوم کے منتشر اجزاء کو یک جا کر دے۔ میں نے ملک کے طول و عرض میں ایک ایک مدرسہ چھان مارا، لمبے لمبے چغوں والے اور لہراتی داڑھیوں والے عالموں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ وہ جو ہر وقت ضخیم جلدوں میں مستغرق رہتے، وہ جن کے سامنے عام انسانی زبان بات کرتے لڑکھڑاتی ہے، میں نے ان سے درس لیا اور انہوں نے مجھے علم سے اس قدر بھر دیا کہ میرے دل میں جذبات کے لئے کوئی جگہ نہ رہی۔ اور جب میں اذان دینے کے لئے اٹھا تو میری آواز میں خشونت پیدا ہو گئی اور جب میں نے مزید کوشش کی تو وہ بھرا کر بالکل بیٹھ گئی۔

صرف ایک شخص مجھے ملا۔ اس سے قہوہ خانے میں شام کے وقت ملاقات ہوئی۔ وہ میرے بالمقابل آن کر بیٹھ گیا۔ اگرچہ اس کے پاس کوئی کتاب نہ تھی اور اس کی داڑھی میں لہریں نہ تھیں تاہم ایک اندرونی حکم نے مجھے اُکسایا کہ میں اس کے سامنے اپنا دامن سوال پھیلاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

وہ مسکرا پڑا۔ اور اس کے موتیوں کے سے سفید دانت چمکے۔ وہ اُٹھا۔ اور مجھے بازو سے پکڑا اپنے ساتھ باہر لے گیا۔

ہم بازاروں، گلیوں اور شاہراہوں سے گذرتے ہوئے دریا کے کنارے جا پہنچے۔

وہاں وہ مجھ سے ہم کلام ہوا۔ "تم اذان سیکھنا چاہتے ہو۔"

"ہاں۔"

"مگر کیا تم سب سے پہلے مؤذن کو جانتے ہو؟"

مَیں نے اپنی بے بضاعتی کا اظہار کیا۔

"تو سنو۔" اُس نے کہا۔ "وہ حبشی تھا، چند کوڑی کا حبشی، اور وہ اپنے آقا سے والہانہ عشق رکھتا تھا۔ ایسا عشق جو تم نے قصوں میں نہ پڑھا ہو۔ اس عشق سے کہیں بالا جسے عام لوگ جانتے ہیں۔ جب وہ اپنے آقا سے دور رہتا تو وہ اس کے پاس پہنچنے کے لئے تڑپتا۔ وہ شاہراہ کے موڑ پہ بیٹھ جاتا اور حسرت بھری نگاہوں سے اس شاہراہ کو دیکھتا۔ جو اس کے شہر کو جاتی۔ اس نے عمر عزیز کی قیمتی راتیں

رونے میں گزار دیں۔ اور جب وہ اپنے آقا کے پاس پہنچ گیا تو اس کی حالت رشک سے بدتر ہو گئی۔ اس کی وجہ ہیں اور تم نہیں سمجھ سکتے۔ اور اس کا آقا، تم جانتے ہو، دنیا کا حسین ترین انسان تھا۔ لیکن وہ اس سے ویسے ہی محبت کرتا۔ کیونکہ وہ حق شناس تھا۔ پھر اس کے محبوب نے اس کو سرفراز کیا۔ اور اُسے اپنا پیغام نشر کرنے کے لئے مقرر کیا۔ مسجد کے بلند مینار پر کھڑا ہو کر وہ لوگوں کو پکارتا۔ وہاں وہ روشنی کے مینار میں نور کی طرح دکھائی دیتا۔ وہ لوگوں کو زندگی کا بنیادی راز بتاتا اور انہیں دارالسلام کی طرف مدعو کرتا۔ ایسے طرز میں کہ کوئی دل اس آواز کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ کوئی کان اس کو اندر گھسنے سے نہ روک سکتا۔ وہ پلٹنے کی کوشش کرتے۔ مگر اُن کے قدم خود بخود اس آواز کی طرف اُٹھے چلے جاتے۔ اور جب وہ اِن الفاظ پر پہنچتا "میں گواہی دیتا ہوں کہ میرا آقا بڑے بادشاہ کا سچا پیامبر ہے" تو وہ انگشتِ شہادت سے اپنے محبوب کی طرف اشارہ کرتا۔ اس پر عالمِ وارفتگی طاری ہو جاتا۔ اس کا محبوب مسکرا پڑتا۔

"پھر ایک دن وہ آیا جب غلام اکیلا رہ گیا اور اس کا آقا بڑے بادشاہ کے پاس چلا گیا۔ تو اُس نے اپنی صدا بند کر دی۔ دُنیا اس آواز سے اتنا مانوس ہو چکی تھی کہ جب لوگوں نے وقت مقررہ پر اس کی آواز نہ سُنی تو انہوں نے محسوس کیا گویا اُن کی زندگیوں کی کوئی قیمتی شے گم ہو گئی ہے۔ ان سب نے اس سے درخواست کی کہ ایک بار، صرف ایک بار وہ پھر وہی تھراتی ہوئی آواز بلند کرے۔ مگر نہیں، جواب کی بجائے آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ انہوں نے مجبور کیا تو وہ مینا

پر چڑھ گیا۔ اور اپنی لرزتی ہوئی آواز کو اُبھارا۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں افق کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ گویا کہ وہ پہاڑی پر کھڑے اپنے آقا کا محل دیکھ رہا ہو۔ اور جب وہ اِن الفاظ پر پہنچا "میں گواہی دیتا ہوں میرا آقا بڑے بادشاہ کا سچا پیامبر ہے" تو اُس نے انگلی اُٹھا کر اپنے محبوب کی طرف اشارہ کیا۔ مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے گر پڑا اور اور۔۔۔۔ اس کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا تھا"

میرے دل میں جذبات کی لہر اُبھر رہی تھی۔ میں نے دیکھا میرا ساتھی دور دیکھ رہا تھا۔ جہاں چھوٹی چھوٹی کشتیاں دریا میں افق کے کنارے تیر رہی تھیں۔ اس کے پرے ایک مسجد کے دو بلند مینار آسمان کے سینے میں کھبے ہوئے تھے۔ اور اُن کے اوپر سفید چاند کھڑا تھا، ہمارے کانوں میں شام کی اذان کی آواز آئی۔

"بالکل بے اثر۔" اُس نے کہا۔ ان کے پیٹ اور جیبیں پُر ہیں لیکن دل خالی ہیں۔ خالی برتن کی طرح اور وہ بھوکے اور غریب تھے مگر دل میں سوز تھا۔ انہوں نے اپنے سر سے دنیا کی خاک جھاڑ دی اور اپنے گوہرِ مقصود کو پالیا"

"کاش میں اس آواز کو سُن سکتا" میں نے آہ سرد بھر کر کہا۔

"چاند کی پہلی رات جب ہلال آسمان پر باریک ناخن کی طرح نمودار ہوتا ہے تو صحرا سے ایک میٹھی ہوا اُٹھتی ہے جو کھجور کے پتوں میں سے ترنم پیدا کرتی ہوئی گزرتی ہے۔ اگر تم غور سے سُنو تو شاید تم بھی اِس ترنم میں وہ آواز سن سکو۔"

"کیا میں سُن سکتا ہوں؟" میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"ہاں، اگر تم متاعِ دُنیا سے بے نیاز ہو اور دل میں درد رکھتے ہو۔"

مَیں خاموش ہو گیا۔ ہم کچھ وقفہ بیٹھے رہے۔ پھر یکایک وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "آؤ چلیں۔"

ہم پھر قہوہ خانے کے سامنے کھڑے تھے۔

"اچھا دوست اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ مَیں نے تمہارا کافی وقت ضائع کیا ہے۔"

"بالکل نہیں میرے دوست۔ مگر کیا تم مجھے وہ طریقہ نہ بتاؤ گے؟"

"کیا تم کو ابھی تک معلوم نہیں ہوا؟" پھر اُس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے مصافحہ کیا اور وہ تین ڈگ بھر کر بھیڑ میں گم ہو گیا۔

میرا دل بے قرار ہو گیا۔ مَیں نے سوچا وہ طریقہ کبھی نہ حاصل کر سکوں گا۔ مَیں نے اُسی وقت عازمِ وطن ہونے کا ارادہ کیا۔ جب جیب ٹٹولی تو تمام نقدی غائب۔ مَیں نے اُس کا نام بھی نہ پوچھا تھا۔ مَیں تیزی سے اس جانب لپکا جدھر وہ گیا تھا۔ مگر سب بے سُود۔

"دھوکے باز۔" مَیں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

میں اس بڑے شہر میں بے یار و مددگار تھا۔ اس لئے رات مجھے بھُوکے ہی کسی مسجد میں گذارنا پڑی۔ نمازِ فجر کے وقت اذان کے لئے مَیں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ جب مَیں نے اذان کہی تو لوگوں نے کہا کہ انہوں نے اس سے پہلے کبھی ایسی اذان نہ سُنی تھی ۔

تحریک

سیاست دان کی تحریک آزادیٔ نسواں دو سال کے بعد رنگ لائی۔ جب ملک کی مجلس مقننہ کے حزبِ مخالف نے بھی اس کے دعویٰ کو تسلیم کر لیا۔ ایوان میں اُس نے اپنی مشہور تقریر ان فقروں پر ختم کی "قوم کی آزادی اور ترقی عورت کی آزادی اور ترقی میں مضمر ہے عورت کو آزاد کر دو اور قوم بجلی کی سی سرعت سے ترقی و عروج کی رفعتوں پر پہنچ جائے گی۔" ایوان تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ اور رؤسائے ملک نے اُس کی حمایت میں ہاتھ بلند کر دیئے۔

مجلس کے اختتام پر سیاست دان فرحاں و شاداں اپنی محبوبہ کے پاس آیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اور چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا "میری جان، میں نے تمہارے لئے وہ کام کیا ہے۔ جو آج تک کوئی سیاستدان

رہنما یا مجدد نہ کر سکا۔ تمہارے ایما پر صرف تمہاری خوشنودی کے لیے میں نے تمہاری جنس کو قعرِ مذلت سے عروج کمال تک لا پہنچایا ہے۔ کیا اب بھی تم خوش نہیں؟ کیا اب بھی تم روٹھے منہ سے ایک بار ہاں نہ کہو گی؟ مجھے حکم دو تو میں حکومت کا تختہ اُلٹ دوں، روسائے ملک تمہارے در پر دست بستہ کھڑے ہوں کیوں میرے پھول، کیا اب بھی میں نظرِ التفات کا حقدار نہیں؟"

وہ مسکرائی اور اس کے دانتوں کی چمک سے سیاست دان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں "کیوں نہیں، امتحان کی کٹھن گھڑیاں گزر گئی ہیں۔ اب ہم ہمیشہ اکٹھے زندگی بسر کریں گے۔"

سیاست دان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور چند ہی دنوں میں آزادیٔ نسواں کا چرچا زبان زد عام ہو گیا۔ اس فیروزمندی پر اس پر تحسین و آفرین کے پھول برسنے لگے۔ بیدار مغز اور روشن خیال لوگوں نے اپنی عورتوں کو رضاکارانہ آزادی دے دی۔ اُنہوں نے دھکے دے دے کر دقیانوسی خیالات کی عورتوں کو گھروں کی اندھیری چار دیواری سے باہر نکالا۔ تحریک چلتی چلتی چل پڑی اور وبا کی طرح ملک میں پھیل گئی شہروں، گاؤں، اور محلوں میں ایسی جماعتیں متعدد قائم ہو گئیں۔ جن کا مقصد وحید مردہ عورت کو زندہ کرنا تھا۔ اور قلیل ہی عرصہ میں ملک کے تاریک کونوں اور شہر کی اندھیری گلیوں سے مدفون حسن برآمد ہونے لگا۔ لوگوں کی حسن ناشناس آنکھیں یہ مناظر دیکھ کر چندھیا گئیں۔ معترض نظر نقادوں نے اس کو پرکھا۔ جرائد و رسائل نے نئی انکشافات سے ملک بھر میں ہلچل مچا دی۔ لوگ حسن کو دیکھ دیکھ کر جھوم رہے تھے، اور

عارفانہ اشعار پڑھ رہے تھے بغیر حسن کی مانگ ہوئی۔ اور یک بیک نئے نئے شاعر، مصور اور سنگتراش پیدا ہو گئے۔ پرانے گھوسٹ راگیوں نے اپنے سُر تال درست کئے۔ اور سازندوں نے اپنی ستاروں کی زنگ آلود تاروں کو نئی کھنکتی تاروں سے بدل دیا۔ شاعر نے الفاظ میں ایسا جادو بھر دیا کہ شعر سنتے ہی تخیل ستاروں کی دنیا میں پہنچ جائے۔ مصور نے تصویر میں نور بھر دیا۔ اور سنگتراش نے آسمانی روح کو پیراہن مرمریں پہنا دیا۔ ملک دُنیا بھر میں حسن و جمال کے لحاظ سے باقی سب ہم عصر ملکوں سے گوئے سبقت لے گیا۔

اور یہ سب کام تنہا سیاست دان کے زورِ بازو کا نتیجہ تھا۔

وہ دونوں ایک خوبصورت محل میں رہنے لگے۔ جو ملک نے سیاست دان کی خدمات کے صلے میں بطور انعام اور شکریہ کے پیش کیا تھا۔ سیاست دان کی زندگی سونے کی طرح دمکنے لگی۔ حسرت و یاس کے بادل چھٹ گئے۔ وہ مسرور تھا کہ اُس نے اپنا گوہرِ مقصود پا لیا۔ دھوپ پہلے سے زیادہ سنہری اور چاندنی چٹکیلی ہو گئی۔ سارا دن وہ مسرت سے کھیلتے، ہنستے اور کھلکھلاتے باز و میں باز و ڈالے اُنھوں نے ملک کی ایک ایک گلگشت، چمن اور سبزہ زار پھولوں کی تلاش میں چھان مارے۔ چاندنی راتوں میں کشتی پر بیٹھے سیاست پر شیریں مباحث چھیڑتے ہوئے اُنھوں نے دریا کی ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیر کر لی۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی محبوبہ کی دلچسپی ان سیروں میں کم ہونے لگی۔ سیر کے وقت وہ

سیاسی بحث پسند نہ کرتی۔ اور ایک دن جب سیاست دان سیر کے لئے تیار ہوا تو اُس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

سیاست دان نے مضطرب ہو کر پوچھا: "میری جان، کس چیز نے تمہیں تکلیف دی، اگر کہو تو میں تمام دنیا کی قوتیں تمہارے قدموں میں لا ڈالوں۔ میری تیتری مجھے ایک بار حکم کرو اور دیکھو میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

"پیارے چند روز سے یہ ساری سیر یا اور بحثیں میرے دل پر گراں گزرنے لگی ہیں۔ بار بار وہی چیزیں، اس تکرار سے اکتا گئی ہوں۔ میں کچھ تغیر چاہتی ہوں۔"

"تو ہم اسے ترک کر دیں گے۔ میں اس پھول کی پتی جیسے نازک دل پر شبنم کا بوجھ بھی گوارا نہیں کروں گا۔ کہو تو میں مُلک کے بہترین شاعروں کی مجلس بُلا لاؤں۔"

عورت نے مسکرا کر اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

چند ہی دنوں میں ملک کا بہترین شاعر اپنے شاگردوں سمیت ان کے محل میں داخل ہوا۔ سیاست دان نے ان کا استقبال بڑے تپاک سے کیا۔ "مگر وہ آپ کے پیچھے کون صاحب ہیں۔" اُس نے ایک گنجے سر والے شخص کی طرف اشارہ کیا جو شاعروں کی ٹولی کے پیچھے گنگناتا آ رہا تھا۔

شاعر نے جلدی سے معذرت کی اور بولا۔ یہ مشہور راگی ہیں۔ جدید موسیقی کے موجد۔"

عورت بے ساختہ بول اُٹھی: "بہت خوب۔"

شاعر نے کہا: "شعر نغمے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ کہاوت ہے کہ موسیقی شاعری کی چھوٹی بہن ہے۔"

اب عورت کے رخساروں پر سرخی عود کر آئی۔ چاندنی راتوں میں، درختوں کی اوٹ میں وہ اپنی محفلیں جماتے جہاں پر چاند کی سیمیں کرنیں پتوں میں سے گھستی کھسکتی ان کے چہروں اور آنکھوں پر کھیلتیں۔ اور وہ سبز سے پر دراز اشعار اور موسیقی کی دھندلی دنیا میں جل پری کی طرح تیرتی ہوئی جا پہنچتی۔ پھر کبھی ایسا ہوتا کہ وہ الفاظ کی سیڑھی پر چڑھتی ہوئی ستاروں کی بستی میں پہنچ جاتی۔ جہاں حسن کی ندی بہتی ہے۔ اور عشق پانی میں اپنے ہی چہرے کے عکس پر رکھیا بیٹھا آہیں بھر رہا ہے اس کے اوپر نغموں کی پھوہار پڑ رہی تھی۔ اس طرح اس کے دن الفاظ اور خیال کے عالم میں گذر رہے تھے۔ سیاست دان خوش تھا کہ اس کی محبوبہ خوش تھی۔

مگر ایک دن سیاست دان کا دل پھر دھک سے رہ گیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ اُس کی محبوبہ کے رخساروں کی سرخی کافور ہوتی جا رہی ہے۔ اُس نے دیکھا کہ جب شاعر اپنی بیاض نکالتے تو وہ دوسری طرف تکنے لگتی۔

ایک صبح سیاست دان نے اس کا چہرہ بالکل سپید دیکھ کر پوچھا "میری جان، کیا وجہ ہے کہ آج گلاب نے اپنا رنگ بدل لیا ہے؟"

اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا: "میں تھکاوٹ اور پستی محسوس کر رہی ہوں۔"

"مگر شاعر اور موسیقار کہتے ہیں کہ ان کا فن روح کو بلند کرتا ہے۔"

"ہاں وہ کہتے ہیں لیکن جلد ہی وہ حسن کو چھوڑ کر اپنے آپ میں کھو جاتے ہیں ہیں۔ وہ خود غرض ہیں۔"

سیاست دان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اور انوکھی تنقید سُن رہا تھا۔

"شاعر کے الفاظ محض کالی روشنائی نظر آتے ہیں اور موسیقی محض نپی تلی متواتر کھٹ کھٹ، میرے تو کان پک گئے ہیں شعر و نغمہ سنتے سنتے۔ میں تبدیلی محفل چاہتی ہوں کیوں پیارے تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ تو اب کے مصوّروں کو بلاؤں، وہ کہتے ہیں ہمارے پاس رنگ و روشنی کی دُنیا ہے اور ہم نظر کے توسّل سے روح پر مرہم لگاتے ہیں۔"

دوسرے دن ملک کا بہترین مصوّر ہاتھوں میں رنگ کا ڈبہ اور موقلم تھامے اپنے جلو میں طلبائے فن کا ایک جمِ غفیر لئے آموجود ہوا۔ اُنہوں نے باغ کے ایک تنہا گوشے کو اپنا مسکن بنا لیا۔ مصوّر عجیب قسم کا آدمی تھا۔ ہر وقت عورتوں اور پھولوں کو خاموش ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا۔ ایسی ٹکٹکی کہ یہی معلوم ہو کہ ابھی اس کو اپنی آنکھوں سے نگل لے گا۔ مصوّر نے عورت کو دن کے سفیدے اور رات کے دھندلکے میں حسن کی لازوال کیفیات دکھائیں وہ خواب کی دُنیا کے تصوّرات کو قرطاس پر لکۂ ابر کی طرح جکڑ دیتا۔ اضطراب اور یاس کو رنگ کی دُنیا میں اور بھی رنگین کر دیتا۔

اُس نے کہا "میں نظر کو قید کر سکتا ہوں۔" اپنے اس دعوے کے ثبوت میں

اس نے عورت کی تصویر بنانی شروع کی۔ اس کے شاگرد قطار باندھ کر بیٹھ گئے۔ اور سب نے اس کی طرف سانپ کی طرح ٹکٹکی لگا دی۔ ہر بار وہ تصویر بنانے بیٹھتا تو کہتا۔ "اب کے میں ایک لازوال شاہکار پیش کروں گا" اور ہر بار وہ منتجب سوچتی کہ وہ شاہکار کب معرضِ وجود میں آئے گا۔

وہ ان سے بھی تنگ آ گئی۔

ایک شام وہ سیاست دان کو اطلاع دیئے بغیر اکیلی ہی سیر کو چل دی۔ اور رات گئے واپس آئی۔ سیاست دان فکر میں غلطاں دروازے پر کھڑا تھا جب وہ آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی محبوبہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اندر آتے ہی وہ کرسی پر گر گئی اور اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ "میرے دل میں اضطراب اور بے کلی طوفانی سمندر کی موجوں کی طرح اُٹھ رہی ہے۔"

"میری جان، کیا مصوّری کا دعویٰ بھی بالکل باطل نکلا۔"

"بالکل، تصویر محض رنگ کے دھبّے ہیں۔ وہ پہلے پہل ہی ایسا نظر آتے ہیں بعد میں وہ بھی آنکھوں کے رنگوں میں گھُل مِل جاتے ہیں مصوّر نے میرے جسم کو اپنی نوکیلی نگاہوں سے چھلنی کر دیا ہے۔ چرہا!"

"اگر کہو تو سنگتراش بُلا لیا جائے۔ وہ موسیقی کو پتھر میں منجمد کرنے کا دعوےٰ رکھتا ہے۔"

تھوڑے ہی دنوں کے بعد باغ میں چاروں طرف اور محل کی طویل غلام

گردشوں میں مکمل اور نامکمل، ثابت اور ٹوٹے ہوئے اعضا والے مجسمے کھڑے تھے۔ وہ اپنی پتھریلی نگاہوں سے گذرنے والے کو گھورتے۔ اور سنگتراش اپنے تیشوں اور چھینیوں سے ان میں جان ڈال رہے تھے۔ ملک کا سب سے بڑا سنگ تراش ایک موٹا آدمی تھا۔ وہ اس کو ہر مجسمے کے پاس لے جاتا اور اُس کی آرائش و جمال کا فلسفہ سمجھاتا۔ اُس نے کہا: "سنگ تراشی حسن کو ٹھوس صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ وہ سماوی حسن کے تناسب اعضا، اور اس کے ڈھانچے کو مرمر میں ڈھال کر دُنیا کے سامنے پیش کرتی ہے۔" ان میں بہترین مجسمہ وہ تھا جس نے نسوانی حُسن کو بے حجاب کر دکھایا تھا۔ اُس نے اِس مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ میری زندگی کا حاصل ہے شاہ ایران اسے اپنے خزانے کے بہترین ہیرے سے خریدنا چاہتا تھا۔"

ایک صبح وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ سیاست دان حالتِ تشویش میں اس کے کمرے کی طرف گیا۔ مگر اُسے اندر سے مقفل پایا۔ اُس نے دستک دی مگر جواب ندارد۔

"میری جان دروازہ کھولو۔"

"آج میں باہر نہیں آؤں گی۔"

"میری نرگس، ایک بار اپنی صورت تو دکھادو۔"

جب اُس نے دروازہ کھولا تو اُس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔

سیاست دان کی زبان لڑکھڑا گئی "میری جان کیا اب کے حسن! مریں بھی تجھے سکون نہ بخش سکا"

جواب دینے کی بجائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "یہ سب عبث ہے، مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا میرا دل خلا میں ڈوبا جا رہا ہے۔ بے قراری، اضطراب، درد اور کرب میرے دل میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وحشی ناچ ناچ رہے ہیں"

سیاست دان گم سم بیٹھا تھا "تم خود ہی کہو، اب میں تمہارے لئے کیا کروں؟"

وہ چپ رہی۔

"میری جان اب تو میں ہی باقی رہ گیا ہوں"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ ہویدا ہوئی۔ گویا وہ اس کی حماقت پر ہنس رہی تھی۔

دوسرے دن جب وہ اُسے جگانے گیا تو بستر میں اس کی بجائے ایک پیلا لفافہ پڑا پایا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ کاغذ کے عین وسط میں ایک فقرہ لکھا ہوا تھا: "تم عورت کو نہیں سمجھتے"

وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ بھوک اُس کے پیٹ میں کلبلانے لگی۔ جب اُس نے اپنے ملازم خاص کو آواز دی تو وہ بھی غائب تھا۔

دوسری ملکی مجلس میں سیاست دان نے ایک زبردست تقریر کی جس کا آخری فقرہ یہ تھا "قوم کا تنزل قریب ہے۔ عورت کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھو کیونکہ عورت

کی خواہشات اس کے گیسوؤں کی طرح دراز ہیں“؎

آدھی موت

جب وہ مجھے پھانسی کے تختے کی طرف لے جا رہے تھے۔ تو مَیں نے اُن سے کہا "یہ آدھی موت ہے۔ تم مجھے صرف اس چیز سے ہلاک کر سکتے ہو۔ جو میری فطرت کے بالکل متضاد ہو۔"

لیکن وہ ہنس دیئے اور انہوں نے پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ڈال دیا۔ میں نے ایک نظر اپنے ماحول پر ڈالی۔ سورج کی آخری کرنیں سبزے پر لوٹ رہی تھیں جلاد نے میرے پاؤں کے نیچے سے تختہ کھینچ لیا۔ اور مَیں مکڑی کی طرح ہوا میں لٹک گیا۔ میں ابھی تک مسکرا رہا تھا۔ میں پھر چلّایا "یہ آدھی موت ہے۔ مجھے مکمّل موت چاہیے نور کی سفید شعاع ہی ظلمت کا سینہ چاک کر سکتی ہے۔ تم میری بات نہیں سمجھے۔"

لیکن ان کے چہرے رات کی سیاہی سے آلودہ ہو رہے تھے۔ اور نزدیکی

پہاڑیوں میں گدھوں کی وحشت زا چیخیں گونج رہی تھیں۔ اُنہوں نے میری بات نہ سنی۔ اِس لئے میں نے پھندا گلے سے اتار پھینکا۔ اگرچہ میرا سر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح میرے شانوں پر لٹک رہا تھا۔ تاہم میں چل دیا۔

کھلی سڑک کے کنارے ایک دوکان میں تنہا لکڑ ہارا اپنے آرے سے لکڑیاں چیر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر طمانیت اور بشاشت کا نور برس رہا تھا۔ اس کی نقرئی داڑھی اس کے سینے پر مورچھل کر رہی تھی۔ اُس کی گہری آنکھیں اپنے کام کے انجام میں کھوئی ہوئی تھیں۔ پھر بھی دکھائی ایسا دیتا تھا۔ گویا اس کی زندگی کا نصب العین محض کام تھا —— فقط کام۔

میں اس کے قریب کھڑا ہو گیا: "لکڑ ہارے، میں نے زندگی کا بیشتر وقت کائنات کے مربوط رشتوں کو توڑنے میں صرف کیا ہے۔ تمام عمر میں فطرت کے بہاؤ کو کاٹنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور تم جانتے ہو۔ آخری کام میں نے کیا کیا؟ میں نے اپنے آپ کو اجل کا گماشتہ بنا دیا۔ وہ اجل جو اصل میں میری گماشتہ تھی۔ پھر میں نے تمام انسانیت کو قتل کر دیا۔ تم میری بات سُن کر ہنسو گے۔ میں نے دراصل ایک ہی انسان کے سینے سے بسنے والی چیز نکالی تھی۔ میں نے اس کے دھڑکتے ہوئے دل کو گھڑی کے خراب ٹکڑوں کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ اور یہی ایک کڑی ہے جو تمام انسانیت کو ملاتی ہے۔ اِس لئے میں نے تمام انسانیت کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر حاکموں نے مجھے آدھی موت کی سزا دی۔ لیکن آہ یہ کتنی دردناک ہے۔ یہ روح کو ہلاک کئے بغیر جسم کو

ہلاک کر دیتی ہے۔ یہ زندگی اور موت کا درمیانی جہنّم ہے۔ یہ موت جو غلامی کی زندگی سے مشابہ ہے۔ تم کتنے کریم النفس ہو۔ تمہارے آرا چلانے والے محنت ہاتھ جب کسی انسانی گوشت کو چھوتے ہیں۔ تو کس طرح موم ہو جاتے ہیں تم مقدّس ہو۔ کیا تم اپنے نیک ہاتھوں سے مجھے اِس آرے سے مکمل موت بخشو گے؟"

لکڑہارے نے آرا الگ رکھ دیا۔ اور ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ کے سفید موتی چمک رہے تھے۔ اور اُس کی نظریں دُور گھوم رہی تھیں۔

معاً دروازہ کھُلا۔ اور ایک شخص اندر داخل ہؤا۔ وہ نہایت غور سے لکڑیاں دیکھنے لگا۔

"بڑے میاں مجھے ساگوان کی لکڑی چاہیئے۔"

لکڑہارا آہستہ سے اُٹھا اور لکڑیوں کے انبار کے نیچے سے دیودار کا تختہ اُٹھا کر اُس کے حوالے کیا۔ گاہک نے بغیر دیکھے قیمت اُس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اور چلا گیا۔

"آہ یہ کیا؟" میں سسکیاں بھرتا ہؤا نکل گیا۔

فوجی چھاؤنی کے میدان میں فوجیوں کا ایک دستہ بندوقیں کندھوں پر رکھے ہم قدم چل رہا تھا۔ ان کے قدموں کی آواز سردیوں کے اولوں یا ساون کے آبی قطروں کی طرح آ رہی تھی۔ ان کے چہرے حکم کے انتظار میں تنے ہوئے تھے! اور اُن کی آنکھیں خود دار ادمی کی موت کے بعد بجھے ہوئے چراغ کی طرح ٹھنڈی اور

سخت ہو گئی تھیں۔

"سپاہیو! تم میرے بھائی ہو۔ اپنے وقت میں مَیں بھی تمہاری طرح استعباد کے مزے لوٹتا رہا۔ تمہاری طرح مَیں بھی اپنی عمر میں الفاظ کا مطیع و منقاد تھا۔ ہاں تمہاری طرح ——— مَیں نے اپنے آپ سے اِس چیز کے متعلق کبھی سوال نہ کیا تھا۔ جو ایک دفعہ میرے دل میں گزر جاتی۔ لیکن تمہارے افعال کا انجام میرے افعال کے نتائج سے کتنا مختلف ہے۔ مَیں نے کسی کو اس لئے قتل کیا۔ کہ میرے قلب سیاہ کو تسکین ہو۔ لیکن تم کسی کو اِس لئے کاٹتے ہو۔ کہ وہ اِنسانیت کے آزاد جسم میں فساد و تعبّد کا پھوڑا نہ بن جائے۔ پھر دیکھو تمہارا کام کتنا مقدّس اور میرا کتنا پست ہے۔ کیا تم مجھے بھی دکھ سے نجات دے سکتے ہو؟ مجھے آدھی موت کی غلامی سے نکالو۔"

اُنہوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔

"ایک ——— دو ——— تین"

گولیوں کی ایک باڑ زمین کے سینے میں کپکپی سی پیدا کرتی ہوئی چلی۔ لیکن گولیاں میرے دائیں بائیں نکل گئیں۔

ایک بار پھر! کیا تمہارے ہاتھ امن کے زمانے میں مرتعش ہو جاتے ہیں۔ تمہاری انگلیوں کو کیا ہو گیا۔ جو دشمن پر چلنے والی توپ کو فتیلہ دکھاتی ہیں۔"

گولیاں پھر سنسناتی ہوئی بندوقوں کی تاریک نالیوں سے نکلیں لیکن نہ جانے کدھر نکل گئیں۔ میری گردن میری موت و زندگی کی طرح میرے شانوں پر بدستور

ٹمک رہی تھی۔

پھر اندھیرے میں سے کانپتی ہوئی آواز اُٹھی" مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ مَیں بے گناہ ہوں۔ ظالمو! تمہاری قوت سے شیطان محفوظ ہے۔ انسان محفوظ نہیں تم میں گولی کو بندوق کی تنگ و تاریک نالی سے آزاد کرانے کی قوت ہے۔ لیکن انسان کو انسان سے آزاد کرانے کی قوت نہیں عنقریب زمین اپنے دہانے تم پر کھول دے گی۔ اور آسمان کے ستارے چنگاریاں بن کر تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

لیکن گولیوں کی سنسناہٹ اِس آواز کو سمیٹ کرے گئی۔ اُن کی آنکھیں خو[illegible] کی موت کے بعد بجھے ہُوئے چراغ کی طرح ٹھنڈی پڑ رہی تھیں۔ صرف اُن کے ہاتھ مصروفِ کار تھے۔

مَیں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ مَیں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور رات کے سایوں کی آڑ میں پناہ لیتا ہوُا نکل گیا۔

پھر مَیں نے ایک بچہ دیکھا۔ جو گھاس کے تختے پر کھیل رہا تھا۔ وہ پھولوں کے سایوں میں تتریاں پکڑتا ہوُا دوڑ رہا تھا۔ ننھّے منے پھُول اس کا دامن پکڑنے کے لئے اپنی پنکھڑیاں پھیلاتے۔ لیکن وہ اس کو جھٹک کر کھلکھلاتا ہوُا بچ کر نکل جاتا۔ بہت مدت کے بعد میں نے اپنے دل میں ایک پُرسرور کسک پائی۔ میرے دماغ میں اندھیری رات کی بجلی کی کوند کی طرح ایک یاد اُبھری کبھی میں بھی بچہ تھا۔ آہ، دلیل و توجیہہ کی خفتگی! تم اس عقل سے بہتر ہو، جو لڑھکتے ہوئے پتھر کی طرح نہیں کسی نشیب کو ہیں

قرار لینے نہیں دیتی۔

میں اپنی لٹکتی ہوئی گردن کو سنبھالے آگے بڑھا۔

"ننھے بچے کبھی میں بھی تمہاری طرح تھا، لیکن میں نے اپنے دل کے آبگینے کو حادثات سے کبھی بچا کے نہ رکھا، کبھی میں بھی اس چمکیلے شیشے سے کائنات کی قوس قزح دیکھ سکتا تھا، لیکن میرا آئینہ جہالت و ضد کے زنگ سے آلودہ ہو گیا۔ تم شبنم کی طرح صاف اور پاکیزہ ہو۔ کیا تم میرے گلے کو ننھی انگلیوں سے دبا کر مجھے مکمل موت بخشو گے۔ بچے تم بھلائی اور نیکی کے مجسمے ہو۔ میری مدد کرو۔"

بچہ جھیل کے کنارے نیلوفر کے پھولوں میں چھپ گیا۔ بیشک پاکیزگی پاکیزگی کو کھینچتی ہے۔ اور میں چل دیا۔

یکایک گھر کی یاد میرے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اور میں سرسبز لہلہاتے کھیتوں کے درمیان پُرپیچ راہ پر ہو لیا۔ پرندے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اور درختوں کی سرسبز شاخیں نوید بہار سنا رہی تھیں۔ راستہ کے دونوں کناروں پر پھولوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے دل کے دامن کو نہ کھینچ سکا۔ اور میں چلتا گیا گھر کی طرف ——— جہاں میں نے معصومیت اور محبت کے دن گزارے تھے۔

معصومیت اور محبت مجھے بھولے ہوئے سبق کی طرح یاد آ رہی تھیں۔ یہی دو شمعیں تھیں جو میری زندگی کے فانوس میں اس اندھیری رات سے قبل جل رہی تھیں۔ لیکن وہ مجھے کہاں ملیں گی؟ اب میں ان سے کس قدر دور پہنچ چکا تھا۔ اتنا دور جتنا آدم نے

زمین پر کھڑے ہو کر پہلی بار ستاروں کی دوری کو محسوس کیا تھا۔ اب میں عمر کے صحرا میں عقل جھکڑ سہہ چکا تھا۔ میں اس جگہ بھی رہ چکا تھا۔ جہاں سے نظارۂ طفولیت فراموش خواب کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ میں نے شعور سوز عرق پیا۔ اور اسے انگور کا پانی کہا۔ میں نے عورت کا مادری چشمہ خشک کیا۔ اور اسے فطرتی جذبۂ محبت سے تعبیر کیا۔ میں نے کسی کے حقِ ملکیت پر چھاپے مارے اور اسے ضرورتِ زندگی کا نام دیا۔ پھر وہ کونسا کام تھا جو میں نے کیا۔ اور اس پر عقل کا ملمع نہ چڑھایا۔ ہر قدم کے ساتھ میں پھولوں سے دُور جا رہا تھا۔ میں خوبصورت وادیوں کو آوارہ پرندے کی طرح چھوڑ رہا تھا۔ بہار میرے لئے اپنی تمام مسرتوں سمیت محض تبدیلی موسم تھی۔ اور قدرت کا ہر حُسن میرے نزدیک ایک اتفاقی جوڑ بن کر رہ گیا تھا۔ لیکن وہ میں کہاں تھا۔ جو قدرت کی گود میں پلا۔ اور قوتِ جمال کے ساتھ بڑھا۔ میرا سر اپنے شانوں پر مردہ پتے کی طرح جھُول رہا تھا۔ میرا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ میں اِس دُنیا سے رخصت چاہتا تھا۔ یہ آدھی موت —— آہ۔

میری آنکھوں کے سامنے میرا گھر تھا۔ جس کے چاروں طرف سُرخ پھُول اور سبز گھاس ہوا کے اشاروں پر جھوم رہے تھے۔ ڈھلتا ہُوا سُورج اس پر طلائی روغن کر رہا تھا۔ وہ واقعی سونے کا گھر معلوم ہوتا تھا۔ میں بے تابی سے آگے بڑھا۔ اور میری آنکھوں کے سامنے میری ماں کھڑی تھی وہ جنگلے پر جھکی ہوئی اپنی ایک ہم عمر سہیلی سے محو گفتگو تھی۔ سورج کی کرنیں پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے نقرئی بالوں کو ملمع کر رہی تھیں۔ "ماں" میں اُسے پکارنا چاہتا تھا۔ لیکن کسی خیال نے

مجھے روک لیا۔ میں مداخلت بے جا نہ کرنا چاہتا تھا۔

وہ اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی، "میرا بچہ وطن سے دور کمانے کے لئے گیا ہوا ہے جب وہ آئے گا تو سونے سے بھری ہوئی جھولیاں میرے سامنے لاکر ڈھیر کر دے گا۔"

میرے بھنچے ہوئے منہ سے سسکیوں کی آواز نکل گئی۔ میں کانپتی ہوئی آواز سے بولا، "ماں تو کچی امیدوں کے ساتھ جھولا ڈال رہی ہے۔ میں تیرے پہلو میں رکھے ہوئے شیشے کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتا —— آہ، شاید تیرا بچہ کائنات کے درخت کے نیچے زندگی موت کے جھولوں میں لٹک رہا ہے۔"

لیکن میری ماں نے کہا، "مجھے یقین ہے۔ وہ جہاں بھی ہوگا۔ خوش و خرم ہوگا۔"

اتنا کہہ کر وہ مڑی۔ میں زور سے چلّایا "ماں! ماں!!"

اُس نے متوحش آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک بھنورا اُڑ رہا تھا۔

وہ انگور کی بیلوں کے نیچے بیٹھ گئی۔ وہ یکایک بہت تھکی تھکی دکھائی دینے لگی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اور اُس کے ہاتھ خود بخود دعا کے لئے اُٹھ گئے۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ جب میں نزدیک ہوا تو وہ میرا نام پکار رہی تھی۔

میں چلّایا۔ ماں، مجھے اپنے سینے سے چمٹا لو۔ میں آدھی موت کے پنجے میں تڑپ رہا ہوں۔"

سُورج پتّوں کے پیچھے چمک اُٹھا۔ اور پھُول اپنی پنکھڑیاں کھولے نیلے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ . . . . چاروں طرف سکوت اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جو وادی کے پھُولوں میں رس کی تلاش میں پھر رہی تھیں۔ میری ماں کی آنکھوں سے وہ آنسو ڈھلکے اور پیشتر اس کے کہ وہ رخساروں سے بہہ کر گرتے میں نے دامن پھیلا کر انہیں لے لیا۔ اور انہیں اپنے سینے سے لگالیا۔ یکایک میں نے محسوس کیا میں آدھی موت کی خلیج سے نکل رہا ہوں۔ آنکھوں کے پانی کے دو قطروں نے وہ کام کیا۔ جو بندوقیں اور آرے نہ کر سکے۔ میں جوشِ اضطراب سے ماں سے لپٹ گیا۔ اس کے سینے سے کیسا چشمہ اُبل رہا تھا۔ جو میرے ریشے ریشے میں رچ رہا تھا۔ اس کی گرمی میرے جسم میں اور میرے دل میں سرایت کر رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر معصومیت اور محبت کی لہر اپنے سینے میں اُبھرتی محسوس کی۔

"ماں" میں نے کہا، "تم نے مجھے آدھی موت کے پنجے سے چھڑا لیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ جس گہوارے نے مجھے عمر کی طرف بڑھایا اس گہوارے میں مسرت کے ساون رنگ اُگائے جاتے ہیں۔ ماں تجھ میں بلند پہاڑوں کی آبشاریں نغمہ سنج ہیں۔ بہار کا سبز آغاز اور خزاں کا سنہری انجام تیرے دل میں سنہری بھنوروں کی طرح گھوم رہے ہیں میں تیرے ساتھ ساون کی بارشوں، گرمی کی لُو اور سردی کے کڑاکے میں رہوں گا۔ اور ماں تو مجھے موت کے بعد نئی زندگی کا سبق دے گی۔"

موت کب آتی ہے

سورج عین نصف النہار پر تھا اور اس کی شعاعیں سیدھے تیر کی طرح ہر شے کے جسم میں چُبھ رہی تھیں۔ رحمت علی سر پر چارے کا گٹھا اٹھائے چلا آرہا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا اور اس کی زبان سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ وہ دیوانے کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ خشک نالے کے پُل کے قریب شیشم کا ایک بڑا درخت زمین پر اپنا ٹھنڈا سایہ ڈال رہا تھا۔ اس کے آگے گاؤں کی قبریں غیر منظم صورت میں بکھری ہوئی تھیں۔ رحمت علی نے درخت کے نیچے اپنا بوجھ پھینک دیا اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے جسم میں ایک ٹھنڈی جھرجھری سی پیدا کرتا ہوا گذر گیا۔ رحمت کے منہ سے بے اختیار واہ واہ نکل گیا۔ پھر اس نے دھوتی کے پلّو سے اپنی پیشانی صاف کی اور ایک گہرا سانس لیا۔ جب اس کا گرم دماغ ٹھنڈا

ہوا تو اُسے اپنی پوری زندگی دھوپ کی طرح چلچلاتی معلوم ہوئی۔ ہر روز اس کا یہی کام تھا۔ .... کڑکتی دھوپ میں باہر جانا اور چارہ کاٹ کر لانا۔ آرام اور چین کب آئے گا؟ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی طبابت کی چھوٹی سی دوکان بھی۔ لیکن دیہات میں مریض بھی کم تھے۔ بچپن سے لے کر پچاس برس کی عمر تک اس کی مفلس زندگی ایک ہی رفتار پر چل رہی تھی۔

"اللہ اگر تو نے اس بوڑھی عمر میں مجھے ایک بچّہ بھی نہیں دیا تو بہتر ہے تو موت ہی بھیج دے میری موت پر میری بیوی کے سوا اور کون رونے والا ہے۔ مختصر سی پونجی پر میرا بھائی قبضہ کرے گا اور تمام پونجی شراب کے گلاس اور جوئے کی بساط پر بہہ جائے گی۔"

یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ پکار اُٹھا۔

"اے موت، اے موت۔ آ اور مجھے عالم آلام سے لے جا۔"

ایکا ایکی سرسوں کے نزدیک کھیت میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک شخص اس میں سے نکلا۔ وہ اسی کی طرف چلا آرہا تھا۔ لیکن اس کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا۔ اس کی داڑھی خشخشی تھی اور بھویں تنی ہوئی۔ اس کی آنکھیں چاند کی طرح گول اور سورج کی طرح تیز تھیں۔ وہ اپنے لباس اور قطع وضع سے کسی نزدیکی علاقہ کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ آیا اور رحمت کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"کہو کیا کہتے ہو۔"

رحمت نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں اس کی آنکھوں میں تیر کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟" رحمت علی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں!" اجنبی نے جواب دیا "تم نے ابھی ابھی مجھے یاد کیا تھا۔

رحمت خطرے کا احساس کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے تتلاتی ہوئی زبان میں پوچھا "یعنی ت ت تم موت ہو!"

"ہاں! تم نے مجھے بلایا تھا۔"

اس کی آواز رحمت کے کانوں میں ایک میخ کی طرح چبھی۔ رحمت نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسکا سر چکرانے لگا۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "مجھے یہ گٹھا اٹھوا دو گے؟"

فرشتہ موت ہنس پڑا۔ اس کی مسکراہٹ پر رحمت کی جان میں جان آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ موت اتنی سنگدل نہیں جتنی کہ سمجھی جاتی ہے۔ رحمت نے پوچھا۔ تم کدھر آئے تھے؟"

"میں رمضان کسان کی جان لینے آیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"رمضان" رحمت بے ساختہ چلا اُٹھا۔ "اسے تو میں ابھی ہل چلاتے چھوڑ آیا ہوں۔"

"ہاں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔"

رحمت کے دل میں جذبہ شوق اُٹھا، کیا تم مجھے دکھاؤ گے۔ موت کیسے واقع ہوتی ہے؟"

"ہاں تم قریبی کھیت میں چھپ کر بیٹھ جانا صرف تم ہی مجھے دیکھ سکو گے۔"

رحمت اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ رمضان درخت کے نیچے بیٹھا حقّہ پی رہا تھا وہ ابھی ابھی کام سے فارغ ہوا تھا۔ بیل دوسرے درخت کے نیچے بندھے چارہ کھا رہے تھے رحمت گندم کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

رمضان بڑے مزے سے حقّے کا کش لگاتا اور اُس کا دھواں ہوا میں چھوڑتا۔ وہ مشکل تیس برس کا ہوگا۔ اس کا مضبوط جسم پھٹے ہوئے کرتے میں سے اپنی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ وہ بار بار گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دور گاؤں کی سڑک پر اُس کی بیوی سر پر ڈلیا اور لسّی کی مٹکی اُٹھائے چلی آ رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ ہوا میں کشتی کے بادبان کی طرح لہرا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر رمضان جلدی سے اُٹھا اور گھڑے میں سے چلّو بھر پانی نکال ہاتھ دھوئے اور کلّی کی۔ پھر اُس نے اپنی چادر گھاس پر بچھا دی۔ اور اس طرح بیٹھ گیا۔ گویا وہ کسی دعوت میں دسترخوان پر بیٹھا ہو۔

اس کی بیوی ہنستی ہنستی آئی اور اس کے سامنے ڈلیا اور لسّی کی مٹکی رکھ دی۔

"آج میں نے آٹھ کنال زمین پر ہل چلا دیا ہے۔" رمضان نے روٹی کا ایک لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔ ابھی اس نے اپنا ہاتھ منہ کی طرف اٹھایا ہی تھا کہ بیل آپس میں بھڑ گئے۔

"ہی ہی"۔ رمضان چلا آیا۔ مگر بیل بدستور ایک دوسرے کو دھکیلتے رہے۔
رمضان نے ہاتھ سے لقمہ رکھ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں رحمت نے دیکھا کہ فرشتہ موت جو درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ مکھی بن کر ایک بیل کے سینگ پر جا بیٹھا جونہی رمضان نے ان کو سینگوں سے پکڑ کر جدا کرنا چاہا۔ اس بیل نے جس پہ فرشتہ موت بیٹھا ہوا تھا۔ یکبارگی سر ہلایا اور رمضان کو سینگوں پر اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اُس کی بیوی واویلا کرتی ہوئی اُٹھی۔ رمضان نے ایک بار آنکھ کھول کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ پھر ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

رحمت کی آنکھیں تر ہوگئیں اور وہ کھیت سے باہر نکل آیا۔ موت کا فرشتہ باہر کھڑا تھا۔ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "دیکھ لیا تم نے؟"

"ہاں زندگی کا انجام دیکھ لیا" رحمت نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔

فرشتہ موت کھڑا ہو گیا "اچھا میں اب رخصت چاہتا ہوں۔ مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں۔"

رحمت نے کہا "ذرا ٹھیرو۔ جانے سے پہلے مجھے بتا دو کہ میری موت کیسے واقع ہوگی؟"

فرشتہ موت مسکرا پڑا۔

"بھولے بھالے انسان تم مجھے زندگی کا مختار سمجھتے ہو۔ درحقیقت میں بھی اسی طرح بے بس ہوں جس طرح تم۔ میں اس خدائے قادر کا ایک عاجز بندہ ہوں۔ وہ

وہ مجھے جس طرح اور جس وقت حکم دیتا ہے۔ مجھے فوراً بجالانا ہوتا ہے۔ یہ تو مجھے بھی علم نہیں کہ کس کی موت کس وقت آئے گی۔ ہاں اتنا میں تمہیں ضرور بتائے دیتا ہوں کہ موت کا آنا بھی ایک قانون کے ماتحت ہے۔"

رحمت پوری جرأت سے اُس کی باتیں سُن رہا تھا۔ "اچھا تو مجھے وہ قانون ہی بتا دو۔"

"تم اس قانون کو ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ جب تمہاری جان لینے آؤں گا اسی وقت تمہیں بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔

۲

جب رحمت گھر پہنچا تو اس کی بھاوج اس کی بیوی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی بھاوج کے دونوں بچے کونلوں سے کھیل رہے تھے۔ رحمت نے گھر میں قدم رکھتے ہی اُن کی طرف دیکھا۔ دونوں عورتیں چولھے کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور اپنے چہرے اوڑھنیوں کی بکلوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ وہ معاملے کا کچھ حصہ بھانپ گیا لیکن اس نے ان کی طرف توجہ نہ کی اور اپنا گھڑا ناند کے قریب پھینک دیا۔ بھینس سبز چارہ دیکھ کر زور سے ڈکرائی۔ رحمت نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور چارہ ناند میں ڈال دیا۔

"کیوں عائشہ کیا بات ہے؟" رحمت نے اپنی بھاوج سے پوچھا۔

عائشہ نے لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا۔ "بھائی کوئی نئی بات ہو تو کہوں۔"

رحمت نے مضطرب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم کے کپڑے

جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ کہیں سُرخ رنگ کی دھجی لگی ہوئی تھی تو کہیں کالے رنگ کی۔ وہ اپنی سسکیوں کو دبانے کے لئے اپنے دوپٹے کا پلّو چبا رہی تھی۔

"کل سے دانے کی ایک کھیل بھی اُڑ کر منہ میں نہیں گئی۔" عائشہ نے دبی آواز سے کہا۔ "معلوم نہیں میری قسمت میں یہ دھکّے کب تک لکھے ہوئے ہیں۔ ابھی تک تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا زمین بھی ہمارے پاؤں کا بوجھ محسوس کر رہی ہے۔"

"فیروز کہاں ہے؟"

"وہ تو کل صبح سے غائب ہے۔"

رحمت دالان میں چارپائی پر جا بیٹھا۔ تھکن سے اُس کے جسم کا رگ و ریشہ چُور ہو رہا تھا۔ اس پر پسینہ اور مکھیاں مستزاد تھیں اس نے اپنے آپ کو زور زور سے پنکھا کرنا شروع کر دیا۔ جب کچھ افاقہ ہوا تو لیٹ گیا۔ مگر اُس کی آنکھیں بدستور چھت کی کڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے دماغ میں ہر قسم کے خیالات بجلی کی سی تیزی سے آتے اور غائب ہو جاتے۔ یکایک اُس نے اپنے ہاتھ کی پشت پر کسی کا ننھا سا نرم ہاتھ محسوس کیا۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ ننھا بچہ اُس کی چارپائی کا سہارا لئے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رحمت نے اُسے گود میں بٹھا لیا۔ پھر اُس کے سر سے خاک جھاڑی۔

"آہ بدقسمت ننھے!" رحمت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

۳

پانچویں دن رحمت سُن رہا تھا۔

"فیروز نے کل لال دین کے کھیت سے ایک کنال چارہ کاٹ لیا ہے"۔

رحمت کی دکان پر بیٹھے ہوئے ایک مریض نے اُسے خبر سنائی اور کھانستے کھانستے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ رحمت نے اپنی آنکھوں سے گندے شیشوں والی عینک اتار کر رکھ دی اور دیوار سے سر لگاتے ہوئے ایک آہ بھری۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بسنے تڑنگے نوجوان کی شکل آن کھڑی ہوئی۔ جو شیشم کے درخت کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ اُس کی بھاری مونچھیں بل کھاتی ہوئی اُس کے رخساروں کی ہڈیوں تک جا پہنچی ہیں۔ اس کی پگڑی اس کے گلے میں لٹکی ہوئی ہے۔ اور اس کے گھنگریالے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ اس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھیں ہر چیز کی گہرائی میں ڈوب جانا چاہتی ہیں۔ وہ باغی تیر کی طرح ہر جسم میں اُتر جاتی ہیں ان کے لئے شکست نہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بید ہے جس سے وہ اپنے جوتے کی نوک کھٹکھٹا رہا ہے۔

کل رات وہ تاڑی کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی اور خوب مخمور ہو رہا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں سُرخ ڈورے لال مچھلیوں کی طرح تیر رہے تھے۔ لال سنگھ نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"فیروز گندم کے دو چھکڑے گاؤں سے نکلنے والے ہیں"۔

فیروز کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

رات کی سیاہی گہری ہو چکی تھی۔ خشک نالے کے پُل کے قریب دو چھکڑے

گندم سے بھرے جا رہے تھے کہ ایکا ایکی دو آدمیوں نے انہیں روک لیا۔ ان کے ہاتھوں میں برچھیوں کے پھل رات کی سیاہی میں بجلی کی طرح چمک رہے تھے اور ان کی آنکھیں چھکڑے والوں کو گھور رہی تھیں۔ ایک نے آگے بڑھ کر ایک بوری اُٹھالی۔ دوسرے نے بھی ایک بوری اپنی پشت پر رکھ لی۔ اور دونوں کھیتوں میں گم ہو گئے۔

دوسرے دن چھکڑے کا مالک فیروز کے پاس آیا۔ وہ اس وقت کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔

"فیروز مجھے دونوں بوریاں واپس کردو۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

فیروز نے اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور دُور شہتوت کے درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"فیروز تم مجھے دونوں بوریاں واپس کر دو۔" اس نے پھر کہا۔

فیروز نے اسکی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ یہی اس کا جواب تھا۔

"ایک بوری ہی سہی۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

"تمہاری گفتگو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔

چھکڑے والے کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ "بدمعاش غریبوں کو لوٹنے والے اگر تم بوریاں سیدھے ہاتھوں واپس نہ کرو گے تو اچھا نہیں ہوگا!"

فیروز نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم مجھ سے مخاطب ہو؟"

"ہاں ہاں تم سے شرابی لٹیرے"۔

فیروز نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا۔ چھکڑے والے نے دیکھا۔ اس کی آستین سے ایک چمکدار خنجر جھانک رہا تھا۔ وہ اس کی طرف ٹکٹکی لگائے بڑھتا آرہا تھا۔

"تم مجھ سے مخاطب ہو؟"

چھکڑے والا یکایک چلاّتا ہوا بھاگا "وہ مجھے قتل کر دے گا۔ لوگو مجھے بچاؤ"۔

فیروز کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ پھر اپنے راستے پر ہولیا۔

جب وہ اپنے بھائی کی دکان کے سامنے سے گذرا تو رحمت نے اُسے آواز دی لیکن اُس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ رحمت علی نے بھاگ کر اسے جالیا "بھائی کی بات سُننا بھی تمہیں ناگوار ہے"۔

فیروز اس وقت بھی نشے میں دھت تھا۔ رحمت کو اس کے منہ سے شراب کی گرم گرم بو آرہی تھی۔ اس کے گلے میں موتیا کا ایک کمہلایا ہوا ہار پڑا تھا۔

"میں نے آواز نہیں سُنی تھی" فیروز نے اسی لاپروائی سے جواب دیا۔

"فیروز تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم دو بچوں کے باپ ہو۔ کل تمہاری اولاد بڑی ہو گی تو دنیا کے منہ سے تمہارے متعلق کیا سنے گی"۔

"یہی کہ وہ بہادر اور نڈر تھا"۔

رحمت نے اپنے ہونٹ غصہ سے چباتے ہوئے کہا "تم ان کے لئے بری

مثال پیدا کر رہے ہو۔"

فیروز کی آنکھیں بے تابی سے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ وہ اِس بلائے ناگہانی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا: "یہ پند ونصائح کے دفتر کس لئے؟ میرا کام اِس زندگی میں بھی چل رہا ہے جسے تم بُری زندگی سے تشبیہہ دے رہے ہو۔ ابھی تک تو مجھے نیکی اور بدی میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوا۔ تم کہتے ہو نیکی سے اِنسان چین کی زندگی بسر کرتا ہے۔ خدا کی رحمتیں اس پر نازل ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں بدی سے بھی اِنسان سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ بدی کی کمائی تو سب سے زیادہ حلال کمائی ہے۔ رات کے بارہ بجے اُٹھ کر بوریاں پشت پر لاد کر لانا، کسی سے لڑنا جھگڑنا اور مار کھانا۔"

فیروز چپ کھڑا رہا۔

"خدا نے تمہیں ایسی نیک بیوی دی ہے لیکن تم ہو کہ اسے بھی فاقوں تڑپا رہے ہو۔ تم کب راستی پر آؤ گے۔ تمہارے ہاتھوں خدا کی مخلوق نالاں ہے، اور تم اور تم خود اپنے لئے کس قدر زہریلا بیج بو رہے ہو۔"

"تو عائشہ تمہارے پاس آئی تھی؟" فیروز نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"تو وہ کس کے پاس جاتی ۔۔۔ تمہارے پاس؟"

فیروز اپنے دانتوں میں ایک تنکا چباتا رہا۔

"اگر تم اپنے بچوں سے بھی تنگ ہو تو انہیں میرے حوالے کر دو۔ میں اُنہیں

پاؤں پڑسوں گا۔ ان ننھی جانوں کا کیا قصور جو تم انہیں بھی غریب عائشہ کے ساتھ فاقوں مار رہے ہو۔ تم جانتے نہیں وہ تمہارے ہی خون سے بنے ہیں۔ اگر اپنے پیٹ کے دوزخ میں کچھ ایندھن ڈال لیتے ہو تو انہیں کیوں بھول جاتے ہو؟"

فیروز نے اپنی بھاری مونچھوں کو بل دیا اور اپنے سر کو پُر زور نفی میں ہلایا۔

"میں اپنے بچوں کا گلا گھونٹ دوں گا۔ میں عائشہ کو بوری میں بند کر کے دریا میں پھینک آؤں گا۔۔۔"

رحمت اس وقت ہوش میں آیا، جب فیروز جا چکا تھا۔

۴

چاند اپنے سایوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ فیروز جوہڑ کے قریب سے ہوتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ اس کی بغل میں ایک بوتل تھی۔ وہ گھر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف اتھاہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے بوتل کو کھولا اور اُس کو منہ سے لگا دیا اور غٹا غٹ ایک ہی سانس میں پی گیا۔ بوتل کو دیوار سے دے مارا۔ پھر دہلیز پہ کھڑے ہو کر دروازے کو زور سے کھٹکھٹایا۔ دروازہ پہلی ہی دستک پر کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ اور کواڑوں کو زنجیر چڑھا دی۔

آنگن میں بیری کے درخت نے چاندنی کو اپنے پتوں میں چھپا رکھا تھا۔ اندرونی کمرے کا سیاہ دروازہ نیم چاندنی میں منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ فیروز آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا "تم اس کے پاس گئی تھیں؟ تم اس کے پاس گئی تھیں!!؟" وہ سایوں کے ساتھ

لگا ہؤا اندر داخل ہؤا۔

عائشہ اپنے مصلّے پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔ "میرے اللہ میرے خاوند کو ہدایت دے۔ میرے اللہ میں جانتی ہوں تو مجھے اپنے دامنِ رحمت میں لینے سے پہلے ٹھونک بجا کر میری اصلیت دیکھنا چاہتا ہے۔ اللہ تو ہی مجھے توفیق دے کہ میں تیرے امتحان میں پُوری اُتر سکوں۔"

باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ جبلّی طور پر جان گئی کہ وہ کون تھا۔ وہ مصلّے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ فیروز دروازے کے پٹ سے لگ کر کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم ——— اس کے پاس گئی تھیں؟"

عائشہ نے لمبے وقفے کے بعد جواب دیا: "میں بھوک سے بیتاب ہو گئی تھی۔"

"ٹھیک" اندھیرے میں سے کرخت آواز آئی۔ "تمہارے گھر میں مٹی نہیں رہی تھی۔"

"میں بھی انسان ہوں ——— میں تو مٹی کھا لیتی۔ لیکن تمہارے بچے کیا کرتے؟"

"انہیں اپنا خون پلاتیں!"

یکایک اندھیرے میں سے ایک ہاتھ اُٹھا۔ اور دھم سے عائشہ کے سر پر گرا۔

"آہ!" وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر گر پڑی: "تم کتنے ظالم ہو۔ تمہیں خدائی قہر کا خوف نہیں۔"

فیروز نے ایک قہقہہ لگایا۔ "خداوندی قہر تمہارے لئے ہے، میرے لئے نہیں۔"

"میری قسمت۔"

وہ خاک میں لتھڑی پڑی تھی۔

"تم اس کے پاس کیوں گئیں؟" فیروز نے کڑک کر کہا۔ "شیطان کی بیٹی۔ کیا وہ تمہارا یار تھا؟"

"نہیں وہ میرا بڑا بھائی ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی تم اپنے بھائی کے متعلق منہ سے ایسے الفاظ نکال رہے ہو؟"

اس نے عائشہ کو چوٹی سے پکڑا اور کھڑا کر کے اس کے پیٹ میں ایک ایسی لات ماری کہ وہ چیخنی کھاتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔

"ظالم! میں تیری امانت اٹھائے پھر رہی تھی۔ یہ تو نے کیا کیا۔"

عائشہ کی کانپتی ہوئی آواز اٹھی اور آہستہ آہستہ تیز اور بلند سانسوں میں گم ہو گئی۔

۵

رحمت علی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سُن رہا تھا۔ لیکن وہ خود بھی اسی طرح بے بس تھا جس طرح عائشہ صرف کبھی کبھی فیروز کو روک کر دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ جب وہ فیروز کے نت نئے کرتوت سنتا تو اُسے اپنی بے کسی اور بے چارگی اور بھی زیادہ شدت سے یاد آتی۔ اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ خود طبیب تھا۔ لیکن اپنے لئے کوئی

ایسی دوا نہ ڈھونڈھ سکا جو اس کے گوہرِ مقصود کو اس کی جھولی میں لاکر ڈال دیتی۔ رات کے سناٹے میں کبھی کبھی اس کے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ جاتے۔ اس کی چارپائی کے قریب فاطمہ سو رہی ہوتی تو گھنٹوں اس کے چہرے کو دیکھتا رہتا۔ پھر معاً اس کے دل میں سوال پیدا ہوتا: "میری موت کے بعد اس کا کون والی ہوگا۔ یہ بیچاری۔" اور اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنا شروع ہو جاتے۔

اس کے بعد عائشہ کی مصیبت کا سوال تھا۔ ایک دفعہ وہ عائشہ کو بچّوں سمیت اپنے گھر میں لے آیا۔ فیروز نے کوئی بات کہی نہ سُنی۔ وہ اس کے گھر کے سامنے سے اس طرح گذر جاتا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ گویا وہ شادی شدہ تھا ہی نہیں۔ وہ پہلے سے زیادہ آزادی کے ساتھ اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو گیا

وہ اِن لوگوں کے لئے بہترین آلہ تھا جو کسی سے انتقام لینا چاہیں۔ کوئی اس کے پاس آتا اور کہتا: "فیروز! فلاں شخص گھر سے نکلے تو اُسے ذرا ٹھیک تو کر دینا۔" فیروز سائل کی طرف اپنی آنکھوں کے مخصوص گوشوں سے دیکھتا۔ اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا۔ پھر وہ اپنے انگوٹھے کو اپنی انگلی پر اس طرح حرکت دیتا۔ گویا وہ روپے کھنکھنا رہا ہو۔ سائل سمجھ جاتا اور اس کی ہتھیلی پر چاندنی کے چند سکّے یا بعض اوقات ایک بوتل رکھ دیتا۔

یہی اُس کا پیشہ تھا اور یہی کام۔ وہ اپنے گاؤں میں ہوا کی طرح آزاد تھا۔ وہ جس شے کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا وہی اس کی تھی۔

جب کوئی اس سے کہتا: "فیروز تم کاشت کاری کیوں نہیں کرتے ؟" تو اس کا جواب یہ ہوتا: "میں یہ سب کام اس دن کروں گا جب میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے۔"

ایک دن وہ رحمت کے گھر آیا اور عائشہ کو زور زور سے پکارنے لگا۔

"کیوں چلاّ رہے ہو؟" عائشہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"تم اسی وقت میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں کسی صورت میں بھی یہاں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

اس کے الفاظ آخری الفاظ تھے۔ عائشہ نے بچوں کو ساتھ لیا اور اس کے آگے آگے ہولی۔

کچھ دنوں کے بعد رحمت علی کو معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے کان میں بھنک ڈال دی تھی کہ عائشہ اور رحمت کا ناجائز تعلق ہے۔

۶

پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد عائشہ کے بچہ پیدا ہوا۔ بچے نے اس دنیا میں آکر چند سانس لئے اور پھر ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی عائشہ کی حالت بھی متغیر ہو گئی۔

جب دائی بچے کو کپڑے میں لپیٹے ہوئے باہر نکلی تو فیروز آنگن میں بیری سے لگا کھڑا تھا۔ وہ چپ چاپ سا تھا۔ اس نے دائی کو باہر نکلتے دیکھا۔ جب وہ

وہ اس کے قریب آئی تو وہ آگے بڑھا۔ دائی نے اس کا مطلب سمجھ لیا اور اُس نے بچے کے مردہ چہرے سے کپڑا اُلٹ دیا۔ بچہ ابدی نیند سو رہا تھا۔ اُس کے ملائم سیاہ بال ریشم کے باریک لچھوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے اس کا حلیہ ہو بہو فیروز سے ملتا تھا۔

"عائشہ کیسی ہے؟"

"وہ تمہیں بلا رہی ہے۔"

عائشہ اندر چارپائی پر کپڑوں میں لپٹی لیٹی ہوئی تھی۔ روشندان میں سے روشنی چھن چھن کر اس کے چہرے کو منوّر کر رہی تھی۔ فیروز اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عائشہ نے اس کی طرف اپنی بھوری آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عائشہ نے کہا: "میں نے اپنے فرض کو پوری تن دہی سے انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر مجھ سے کوئی خطا ہوگئی ہو تو مجھے معاف کرنا۔"

اُس نے دیکھا فیروز کی آنکھوں سے ایک آنسو ڈھلکتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ عائشہ نے کہا:۔

"خدا ہم سب کو معاف کرے ہم بہت کمزور ہیں۔ ہم پہاڑوں کو گرا سکتے ہیں لیکن نفس کے مقابلہ میں شکست کھا جاتے ہیں۔ عمر بھر کام کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس زندگی سے رخصت ہوتے وقت گناہوں کی ایک گٹھڑی ہی سر پر ہوتی ہے۔ میں اس دن سے ڈرتی ہوں جب ہمارے اعمال نامے جب ہماری پوری زندگی کی گزاری

ہمارے سامنے پیش ہو گی۔"

فیروز کا مضبوط سر عائشہ کے سینے پر ڈھلک گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اسی شام عائشہ مر گئی۔

۷

فیروز اب بہت کم باہر دیکھا جاتا۔ اب وہ غنڈوں کی مجلس میں ہوتا نہ شراب کی دکان کے بنچ پر لیٹا پایا جاتا۔ اگر کوئی اس سے ملنا چاہتا تو اُسے گھر پر ہی پاتا۔ جہاں وہ بیری کے نیچے چارپائی پر بیٹھا اپنے بچوں کو کھلاتا ہوتا۔ اگر کوئی اسے مار پیٹ کے لئے کرائے پر لینا چاہتا تو اوّل وہ خاموش ہو جاتا۔ اگر زیادہ اصرار کرتا تو صرف اتنا کہہ دیتا: "جی نہیں چاہتا"۔

عائشہ دو بچے چھوڑ گئی تھی۔ ایک چار سال کا بچہ اور ایک دو سال کا۔ رحمت علی نے عائشہ کی وفات کے بعد چاہا کہ بچوں کے بارے میں فیروز سے گفتگو کرے اور ان کو اپنے سائے میں لے لے۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔ آخر کار وہ خود ہی محسوس کرنے لگا کہ فیروز کو آپ ہی اپنے بچوں کی نگہداشت کرنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ اُس نے سوچا شاید بچوں کا بوجھ اس کو راہِ راست پر لے آئے۔

۸

عائشہ کی موت کے کچھ دن بعد واقعہ ہے ایک دن رحمت علی شام کے وقت دکان بڑھا کر گھر آیا تو اپنی بیوی کو دالان میں ٹوٹے ہوئے چھنگے میں سنگیاں بھرتے

ہونے پایا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے یہ منظر دیکھ کر دریافت کیا۔

لیکن وہ چپکے چپکے روتی رہی۔

"کیا وہ راز میرے لئے نہیں؟" رحمت علی نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔"

فاطمہ اُٹھی اور اس کے سامنے کھانا چُن دیا۔ رحمت علی نے کھانا شروع کر دیا اور فاطمہ پھر بیٹھ کر سسکیاں لینے لگی۔ رحمت علی آہستہ آہستہ لقمے چباتا اور سوچتا رہا۔ وجہ کیا ہے۔ لیکن کچھ نہ جان سکا آخر کار اُس نے فیصلہ کیا کہ یہ بھی ایک قسم کا دورہ ہے جو عموماً عورتوں پر گذرے ہوؤں کی یاد سے پڑ جاتا ہے۔

رات کو سوتے وقت اُس نے اپنی بیوی سے پھر وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ تمھیں بتانے سے کیا فائدہ ——؟"

"فاطمہ تمھیں میری قسم ضرور بتاؤ۔"

لیکن فاطمہ بدستور چپ رہی۔

"اگر تمھیں کوئی بات بتاؤں تو تم اسے صحیح مانو گے؟"

"ہاں۔"

"تم اپنے بھائی کی رعایت کرو گے۔"

رحمت علی کی حیرت، قدرے کم ہوئی۔ اُس نے سوچا یہ بھی کوئی فیروز کی شکایت ہوگی۔

"نہیں تم کہو تو سہی۔"

"وہ آج یہاں آیا تھا۔ اپنے بچوں کو ساتھ لایا تھا اور کہتا تھا کہ میں انہیں تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں۔"

رحمت علی ہنس پڑا۔ "بس اتنی سی بات، یہ بھی کوئی معاملہ تھا جسے تم سوہانِ روح بنا لیتیں، ہشت۔"

"نہیں، نہیں" فاطمہ نے جھنجھلا کر کہا "تم بات نہیں سمجھے، وہ کہتا تھا میرے گھر چل کر رہو۔"

"کیا کہا؟" رحمت علی نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں ہاں اس نے یہی کہا تھا۔ وہ سخت اصرار کرتا رہا۔ حتےٰ کہ مجھے چیخنا پڑا۔ وہ شراب سے مخمور تھا اور کہتا تھا کہ میں اپنے بھائی سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔"

رحمت علی کی آنکھوں کے سامنے اس کی بیوی کی شکل گھومنے لگی۔ چارپائیاں چھت، اور مکان سب اُلٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کوئی اس کا گلا دبا رہا ہے۔ اور وہ اس کے ہاتھ اپنے گلے سے اُس وقت تک الگ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس ہاتھ کو کلائی ہی سے نہ کاٹ دے۔ بس یہی علاج ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اس کے دل پہ ہاتھ ڈالے اور وہ بت بنا رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ کوئی

سربازار اس کی بے عزتی کرے اور وہ چپ بیٹھا رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"
اس کی بیوی سسکیاں بھر رہی تھی اور کہہ رہی تھی: "اپنی زندگی بھر میں میں نے کسی سے ایسے الفاظ نہ سنے تھے۔ اگر اس وقت مجھے تمہارا خیال نہ ہوتا تو میں ضرور اپنا گلا کاٹ لیتی۔ اُف۔ اُف۔ اُف!!!"

رحمت علی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی آنکھیں غیر معمولی قوت سے چمک رہی تھیں
"مجھے خنجر دو میں اس کا قصہ پاک کر دینا چاہتا ہوں۔ میں خلق خدا کے لئے کانٹوں بھرا راستہ صاف کر دوں گا۔"

اس کی بیوی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ دُنیا کا شور، قتل قتل کی آوازیں، ہلچل اور شیشم کے ٹھنٹھ کے نیچے لٹکتی ہوئی اُس کے شوہر کی لاش، سبھی کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے چند ہی لمحات میں پھر گیا۔ وہ چیخ مار کر اس کے قدموں میں گر پڑی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔
"تم نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

لیکن رحمت علی بدستور اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی مٹھی زور سے بھنچ گئی۔ اس کے جسم کی تمام قوت اس کے بازوؤں میں جمع ہو گئی تھی۔
"پیالہ چھلک چکا ہے۔ اب تم مجھے چھوڑ دو۔"

رحمت علی نے اپنی بیوی کو ایک ٹھوکر لگائی۔ اور لپک کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ فاطمہ بے تحاشا اس کے پیچھے بھاگی۔ لیکن رحمت علی اپنا دامن چھڑا کر پوری تیزی

سے سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ یکایک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ بیس زینے لڑھکتا ہؤا نیچے بے ہوش آن گرا۔

جب اُسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو دالان میں چارپائی پر پایا صبح کا تازہ سُورج چمک رہا تھا۔ اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھی اُسے پنکھا کر رہی تھی۔ اور ڈاکٹر اس پر جھکا ہؤا اسے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پیچھے فیروز غمگین نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی رحمت غصّے سے چیخ اٹھا" نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

اس نے بمشکل فقرہ ادا کیا تھا کہ اس کا سر چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے دُنیا گھُومنے لگی۔ اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

دوپہر کے قریب اُس کی آنکھ کھُلی۔ اس کی بیوی اُسے پنکھا کر رہی تھی۔ اور ڈاکٹر ایک دوائی تیار کر رہا تھا۔ جب ڈاکٹر نے رحمت کو بیدار ہوتے دیکھا تو وہ اس کے قریب آیا۔

"کیا تم اب کچھ افاقہ محسوس کرتے ہو؟"

رحمت علی نے اپنے سر کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہ ایک پتھّر کی طرح جما ہؤا تھا اس نے اپنے سر کو ٹٹولا۔ سر بھاری پٹیوں میں چھپا ہؤا تھا۔

"میرا سر مردہ ہو چکا ہے۔"

اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپائے سسکیاں بھر رہی

تھی۔ ڈاکٹر رحمت علی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا بہت جلدی۔"

رحمت علی دل ہی دل میں ڈاکٹروں اور طبیبوں کے اس فریب پر ہنسا۔ وہ کہنا چاہتا تھا "میں بھی طبیب ہوں" لیکن اس کی زبان کو یارائے کلام نہ ہُوا۔

ڈاکٹر نے اُسے ایک پیلے رنگ کی دوائی پلائی اور قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ رحمت علی کی آنکھوں کے سامنے رات کے واقعات ایک بے ترتیب صورت میں آنا شروع ہو گئے۔ یکایک اُس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ زندگی کو بالکل چھوڑنا چاہتا تھا۔

شام کے قریب ڈاکٹر نے اُسے ایک اور خوراک پلائی۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا مَیں بچ جاؤں گا؟" رحمت نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"یقیناً، یقیناً" ڈاکٹر نے فاطمہ سے فیس لیتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اس نے اپنا چھوٹا سا چرمی بیگ اُٹھایا اور نکل گیا۔ فاطمہ نے چراغ روشن کیا۔ اور اس کی پائینتی بیٹھ گئی۔

"کیا اب کچھ افاقہ ہے؟"

رحمت علی نے آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی پُرنم آنکھوں میں دیئے کی سُرخ لَو ناچ رہی تھی۔

"فاطمہ اگر میں مر گیا تو تم کیا کرو گی؟"

فاطمہ نے پھر رونا شروع کر دیا۔ "للہ ایسا مت کہو۔ تم اپنی موت سے پہلے مجھے مار دو گے۔"

رحمت علی کو اس وقت اپنا بچپن یاد آگیا۔ کس طرح وہ گلیوں کی سنہری دھوپ میں لوہے کا چکر چلاتا دوڑتا پھرتا تھا۔ پھر وہ اپنے باپ کی انگلی پکڑے کھیتوں میں جاتا سبز سہانے کھیت چاروں طرف پھیلے ہوتے۔ اُس کا باپ پنجبارے کے درخت کے نیچے ایڑیاں اٹھا کر اُسے ایک سرخ پھول توڑ دیتا۔

"کیوں بے رحمت تو بڑا ہوگا تو کیا بنے گا؟"

"بابو۔"

اس کا باپ کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اور اس کا دانتوں سے خالی منہ کھل جاتا۔

پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اور اس کی چاند سی بیوی آگئی۔

رحمت علی نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "تمہیں شادی کی چاندنی راتیں یاد ہیں۔"

"ہاں یاد ہیں۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

پھر اس کی شادی کے فوراً بعد ہی ساس بہو کا قدیم ازلی جھگڑا شروع ہو گیا۔ اور جب اس کی بوڑھی ماں نے نوخیز نسل کی جگہ چھیننی چاہی تو وہ مر گئی۔ کچھ مہینوں کے بعد بوڑھا باپ بھی مر گیا۔ اور وہ اپنی طب کی دکان میں اکیلا رہ گیا۔ اب وہ انسانوں کی زندگی کو موت کے کنارے سے واپس لانے کا پیشہ کرتا تھا۔ لوگ خوش ہوتے تھے اور اپنی زندگی کی قیمت صرف چند "سکے" دیتے تھے۔

"زندگی" رحمت بڑبڑایا۔ اس کے دل میں درد ہونے لگا۔ اسے گذشتہ زندگی مرے ہوئے بچے کی طرح یاد آرہی تھی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آسمان پر ستارے ٹمٹمار ہے تھے۔ چاروں جانب گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فاطمہ اونگھتے اونگھتے اس کی چارپائی کی پٹّی سے سر لگا کر سو گئی تھی۔ اُسے بھی نیند کی جھپکی آئی۔ لیکن پھر یکایک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ساری کوٹھڑی کسی آسمانی نور سے روشن ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنے کانوں میں بھاری پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنی۔ اس کے سامنے فرشتہ موت کھڑا تھا۔ جو اس دن اسے دیہقانی لباس میں ملا تھا۔ اب وہ نور میں ملبوس تھا۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

"کیا میرا وقت آگیا ہے"۔ رحمت نے پوچھا۔

"ہاں دوست، اب تمہاری مہلت ختم ہے تم نے زندگی کا جام خوب پیا۔"

لیکن جب رحمت نے سوچا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ ابھی جام کو منہ لگانے ہی لگا تھا۔

"مجھے تمہارا ایک وعدہ یاد آرہا ہے"۔ رحمت نے کہا۔

"ہاں" فرشتے نے جواب دیا۔ "تم یہ راز معلوم کرنا چاہتے تھے کہ موت کب آتی ہے۔ یہ موت کا راز نہیں، زندگی کا راز ہے"۔ رحمت نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا وہ بدستور سو رہی تھی۔

انسان کو زندگی اس وقت تک عطا ہوتی ہے جب تک کہ وہ اپنے لئے اور

اور نوعِ انسانی کے لئے مفید ثابت ہو اور جب اس کی افادیت ختم ہو جائے اسی وقت اُس کی موت آ جاتی ہے۔ تم نے اپنی زندگی پر غور کیا۔ کل رات جب تم سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے تھے۔ اس وقت تم انتہائی غصّے میں تھے۔ اگر تم نہ گرتے تو تم فیروز کو ضرور قتل کر دیتے۔ کیونکہ وہ اس رات شراب سے خوب مخمور ہو کر سویا پڑا تھا۔ اگر تم اُسے قتل کر دیتے تو اس کے بچّوں کی پرورش و نشو و نما بہت حد تک رک جاتی اور قدرت تم سب کو دُنیا میں محض اِس لئے ڈھیل دے رہی ہے کہ تم ان نئے شگوفوں کی ترقی کے موجب بنو اور ان کی راہ میں حائل نہ ہو خزاں اِسی لئے آتی ہے کہ بوڑھے پتّے نئے شگوفوں کے لئے راستہ چھوڑ دیں۔ وہ اسی وقت تک شاخ پر لگے رہتے ہیں جب تک کہ وہ اپنا کام انجام دیتے رہتے ہیں۔ اور درخت کو من حیث المجموع فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور جونہی وہ کام کے اہل نہیں رہتے ان کے پاؤں خود بخود چھوٹ جاتے ہیں اور وہ لڑھکتے ہوئے زمین پر آ گرتے ہیں۔ عائشہ کی زندگی بھی اسی لئے چھین لی گئی کہ اگر وہ زندہ رہتی تو فیروز ہمیشہ لاپروا رہتا اور نچے پانی کے تنکوں کی طرح اِدھر اُدھر بہتے پھر کیا نیک کیا بد دنیا میں ہر ایک کا یہی حال ہے۔ ان کا زمین پر چلنا پھرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قدرت کے کسی مقصد کے لئے ابھی تک مفید ہیں۔"

رحمت نے ایک لمبا سانس لیا۔ "میرے بعد فاطمہ کا کیا بنے گا۔"

"تم دیکھ لوگے۔" یہ کہہ کر فرشتہ آگے بڑھا اور اس کے دل پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

زندگی کی لہر اس کے پاؤں سے چڑھتی ہوئی اوپر چلی آرہی تھی۔ جوں جوں زندگی دل کے قریب پہنچتی جارہی تھی۔ وہ بلند سے بلند ہوتا جارہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا گویا وہ نادیدہ آفاق کی فضاؤں میں پہنچ گیا ہے۔

دُور سے مؤذن کی تھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی "اللہ اکبر! اللہ اکبر" اور رحمت کا آخری سانس ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے جسدِ خاکی سے نکل گیا۔ جب اس کی رُوح اپنے نشیمن سے نکل رہی تھی تو اس نے دیکھا فیروزا اپنے دونوں بچوں سمیت اندر داخل ہوا۔ فاطمہ چارپائی کی پائینتی سے سر لگائے ڈھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب ہوا۔ وہ پہلے سے بہت بوڑھا اور سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"فاطمہ" اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"میرا گناہ معاف کر دو۔ اٹھو اور ان بچوں کو اپنے دامن میں چھپا لو ——"

درونِ سینہ و بیرونِ وے

فلسفہ کیا ہے؟

میں نے اِس پر اپنی زندگی کا ایک حصّہ صرف کر دیا ہے لیکن ہمیشہ میری جستجو اوڈیسیس کے اسفار کی سی رہی ہے۔ میں نے کتابیں کھنگالیں، علم کے صحرائی ذرّوں کو چھان ڈالا، لیکن فلسفہ کہاں تھا؟ کسی نے کہا یہ علوم کے تاروں سے اپنی قبا بُنتا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں اگر تار ہی کچّے ہوں تو قبا کیسی ہوگی؟ کوئی کہتا ہے یہ کُل کی روشنی میں جزو کا مطالعہ کرتا ہے۔ میں ہنس دیتا ہوں اور لفظ روشنی کاٹ کر سایہ لکھ دیتا ہوں۔ کیونکہ انجام ہمیشہ مبہم، غیر واضح اور غیر شفاف ہوتا ہے۔ ہاں اتنا اب میں ضرور جان گیا ہوں کہ فلسفہ کب آتا ہے۔ یہ متاہّل زندگی سے پہلے اور فارغ البالی کے بعد آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ فقط فکری وقائع نگاری ہے۔

پھر میں شمالی ٹملیوں کے قریب آرام کرسی ڈال دیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ تخیل اور حقیقت کی درمیانی خلیج کو کیونکر پاٹا جائے؟

چودہ برس تک مَیں نے علم کی جبہّ سائی کی، تب کہیں میں علوم متعارفہ کی ابتدائی منزل طے کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد جب مَیں نے ارم علوم پر ایک نظر ڈالی تو فلسفے نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ جب مَیں اس کے قریب ہوا تو حکمت کی طلائی دیوی نے میرے دل کو بالکل ہی موہ لیا۔ لیکن جس وقت مَیں اس کے باغ میں داخل ہونے لگا تو منطق کے خاردار کانٹوں نے میرے پاؤں چھلنی کر دیئے میں سخت مایوسی کی حالت میں پلٹنے ہی والا تھا کہ پھر خیال آیا کہ ہر بہار سے پہلے خزاں آتی ہے اور ہر کامیابی کی راہ پیچ و بل کھاتی ہوئی منزل تک پہنچتی ہے میں اپنی کاوش میں پھر کوشاں ہو گیا۔ اور جلد ہی اِس مرحلے کو بھی طے کر لیا۔ اس کے بعد ایک نئی منزل سامنے آئی۔ یہ ذرائع علم کی بحث تھی۔

مَیں نے اُسے دیکھا اور دماغ کھولانے کے لئے ایک نیا الاؤ تیار پایا۔ اس میں مادّہ و فواد کی جنگ تھی۔ یونانی دیمو قریطس نے نہایت بھلے پن کے ساتھ مادیّت کی عمارت میں عینیّت کو بٹھا دیا۔ اور یورپی دیکارتے نے اپنی ذاتیت کو اپنے طلسم خیال کا مرہونِ منّت سمجھ کر نئی مادیّت کی بنیاد رکھ دی۔ اب موضوعیّت و معروضیّت کی بحث شروع تھی۔

جب یہ معاملہ دیکھا تو میری ہمت بالکل ہی پست ہو گئی۔ مَیں نے اپنے

دماغ کے لئے یہ سب الاؤ بہت زیادہ گرم پائے۔ اِس لئے بہتر یہی سمجھا کہ کسی صاحبِ علم کے پاس چلا جاؤں۔

چنانچہ میں نے اپنا رختِ سفر باندھا اور مغرب کی راہ لی۔ مدّت ہوئی ہے مغرب نے مشرق سے نظر و مشاہدہ چھین لئے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرق کی سرزمین کچھ ایسی زرخیز بھی نہیں رہی۔ وہاں پہنچتے ہی خوش قسمتی سے مجھے ایک ایسا رہبر مل گیا۔ جو سراپا علم تھا۔ اُس نے میری شکل و صورت دیکھ کر سمجھ لیا کہ میں فی الواقع علم کا خواہاں ہوں۔ پھر اُس نے مجھ سے پوچھا: "تم مادہ کو خمیرِ کائنات سمجھتے ہو یا فواد کو؟"

میں نے کچھ توقف کیا، پھر کہا: "اگرچہ دنیا میں رہتے ہوئے مجھے کئی برس گزر گئے ہیں اس کے باوجود میں خود حیران ہوں کہ گرمی کو سورج کا رہینِ منّت سمجھوں یا اسکی غیر مرئی شعاعوں کا۔"

وہ زیرِ لب مسکرایا اور کہنے لگا: "تمہاری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟"

اعترافِ شکست سے میں نے کہا: "مادہ"

"تو پھر ایسی گنجلک میں محبوس ہونے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ ہر چیز واضح ہے۔" اس نے اپنے فلسفے کی کڑی اٹھائی: "یہ صرف مادی وجود ہی ہے۔ جو اشیاء کا ادراک کر رہا ہے۔ تمہاری آنکھیں ہی تو ہیں جو سورج کی روشنی اور الوان کی بوقلمونی کو دیکھ رہی ہیں۔ تمہارے کان ہی تو ہیں جو موسیقی کی میٹھی لہروں کو وصول کرتے ہیں اور سماعت کی ایک فردوس تمہارے لئے بچھا دیتے ہیں۔ تمہارا ہاتھ اُٹھتا ہے

اور اشیاء کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ تمہارے قدم اُٹھتے ہیں اور کائنات کی وسعتوں پر گھوم جاتے ہیں۔

"پھر ذرا تم اپنے عصبی نظام پر ایک نظر ڈالو۔ بیرونی دُنیا کی ہلکی سی جنبش تمہارے جسم میں کپکپی پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیا یہ فواد کی کارفرمائی ہے؟ اگر فواد ہی احساس کائنات کا مہبط ہوتا تو جب تمہاری داڑھ دُکھ رہی تھی اور طبیب نے تمہارے مسوڑھوں کو مخدر کر دیا تھا تو تمہارے درد کیوں بند ہو گئے؟ وہ درد کہاں گئے؟ کیا وہ تمہارے جسم ہی کے پیدا کردہ نہ تھے؟ اسی مادے میں وہ اسرار نہاں ہیں کہ دماغ جیسی عظیم الشان چیز پیدا ہو گئی۔ جدید دریافتیں اور تجربات ظاہر کر رہے ہیں کہ حیات کا بنیادی ذرہ (تخم مایہ) کس طرح ترقی کرتے کرتے اس منزل پر پہنچ گیا۔ اگر تم فواد کو ماننے پر بہت ہی مصر ہو تو اتنا کہہ لو کہ وہ دماغ، جو مادہ کی کامیاب تخلیق ہے، ارتقائی زینے طے کرتا ہُوا فواد کی پیچیدہ منزل پر پہنچ گیا ہے حقیقت وہی ہے جس کو تم نے سفر کے پہلے سنگِ میل پر دیکھا تھا۔ تمہارا فواد کوئی ایسی آزاد شے نہیں۔ جو تمہارے وجود پر حکمران ہو بلکہ محض ایک غلام حلقہ بگوش جس کو کوتاہ بینوں نے بھڑکیلی پوشش میں ملبوس دیکھ کر شاہ سمجھ لیا۔"

اس کے الفاظ میرے کانوں پر اس طرح پڑ رہے تھے جیسے رم جھم پھوار پڑ رہی ہو۔ میں نے دبی زبان سے کہا "لیکن ظاہر میں ایسا دکھائی دیتا ہے گویا فواد ایک حاکم کی حیثیت سے ہمارے وجود پر متمکن ہے مثلاً کہ اگر روزمرہ کو

دیکھا جائے تو اس میں اس قسم کے محاورات اور الفاظ بکثرت مل جائیں گے جو اسی خیال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔"

وہ پھر مسکرایا، لیکن اب کے ترش طنز اس کی مسکراہٹ میں اپنی جھلکیاں دکھا رہی تھی۔

"جب جسم بیمار ہوتا ہے تو اس وقت تمہارا دل مسرور ہوتا ہے؟"

یہ سوال واقعی ٹیڑھا تھا، میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ یکایک میں نے محسوس کیا۔ گویا اس کی نظریں میری گردن میں پیوست ہو رہی ہیں۔

"لیکن کوئی مضائقہ نہیں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "ایسے شبہات ہر شخص کے دماغ میں قدرتی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دراصل مادہ ہی فاعلِ کُل ہے، وجود کی جنبش و حرکت ہمارے ہر فعل و عمل کا باعث ہے۔ محبت جیسی لطیف شے بھی وجودی تہیّج کے بغیر ناممکن ہے۔ کم از کم میں نے تو کسی آختہ کو محب و محبوب بنتے نہیں دیکھا۔ بھوک، شہوت، غرض کسی جذبے کو لو اس کے پردے میں وجود کا ہی غیر مرئی ساز بج رہا ہو گا۔"

اس کے علم و دانش سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ جب میں بازار میں آیا تو ہجوم کا شور و شغب بھی مجھے متشکل دکھائی دینے لگا۔ رات جب میں مطالعہ کرنے کی بجائے بستر پر دراز ہو گیا تو یکایک مجھے احساس ہوا کہ میں تو پکا مادہ پرست ہو گیا ہوں۔ صبح میں نے اپنے تمام نظریات کی دوبارہ قطع و برید کی اور جوں جوں میں سنے

حقیقت کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔ مجھے یقین واثق ہوتا گیا کہ خالق کُل اصل میں مادّہ ہی ہے۔

مَیں اس موقف پہ مضبوطی سے جما رہا حتیٰ کہ ایک ضیافت میں میری ملاقات ایک سائنسدان سے ہو گئی۔ باتوں باتوں میں ہمارا موضوعِ کلام اِسی طرف جھک گیا مَیں نے مادیت کی پُرزور حمایت کی۔ اِس پر اُس نے میری طرف تحیّر کن نگاہوں سے دیکھا اور کہا "آپ اِس وقت غالباً اسی بات کو دُہرا رہے ہیں جس کو سائنس نے عرصہ ہوا عضوِ بے کار سمجھ کر کاٹ دیا تھا۔ میرے خیال میں آپ سائنس کی تازہ ترین خبروں سے ہنوز لاعلم ہیں۔"

مجھے اپنی کم مائگی کا اعتراف کرنا پڑا۔

"خیر سائنس نے جب پہلے پہل سالمے کے وجود کی دریافت کی تو مادیّت نے اسی وقت اپنی فتح کا ڈنکا بجا دیا اور تمام اہلِ علم کو تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کی اساس مادہ ہی ہے۔ لیکن جب تجربات کا ہاتھ سالمے کا بھی جگر چاک کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے پایا کہ اس کے اندر تو صرف ایک توانائی ہی کام کر رہی تھی۔ اِن حالات کے ماتحت پُرانے نظریے کا جائز ہونا سخت دشوار ہو گیا۔ ایک یہودی حکیم کی اضافیت اور برق کے کوانٹم اس پر پے درپے ضربیں لگا رہے تھے۔ اور آخر کار مادیّت کی خاک سے ایک ایسا ہیولیٰ اُٹھا جس کے اندر ایک ریاضی داں روح کام کر رہی تھی۔"

میں بڑا اسٹ پٹا یا۔ میں نے بڑی گرما گرم بحث کی لیکن وہ حقائق سے مسلّح کسی صُورت بھی جُھکنے کو تیار نظر نہ آتا تھا۔ لہٰذا مجھے ہی جُھکنا پڑا۔

اب مَیں نے غیبیت کا منظّم مطالعہ شروع کر دیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد مَیں نے محسوس کیا کہ فرائڈ میرے تحت الشعور کے چور دروازے سے دبے پاؤں گُھس رہا تھا۔ عین پرستوں کے دلائل مجھے روز بروز لبھاتے جارہے تھے۔ مدعیان عین بالکل بجا تھے جب وہ کہتے کہ "آخر مادہ کیسے درد محسوس کر سکتا ہے؟"

مادہ پرست کے لئے یہ بات لوہے کے چنے تھی۔

اس کے بعد عین پرست مزید استفسار کرتا: "اس تصوّر کی توجیہ تم کیسے کرتے ہو جو مادے کی کثیف چادر پھاڑ کر مکان و زمان کی حدود سے بلند پرواز کرنے لگتا ہے؟"

مادہ پرست اپنے مخصوص انداز ڈھٹائی میں اسے بھی مادہ کی انتہائی بلندی کہہ سکتا تھا لیکن مسئلہ شعور اس کے دل میں تیر کی طرح چُبھتا رہتا۔ بڑے بڑے مادہ پرستوں کو بھی شعور کے نام پر کان دبا کر چلنا پڑتا۔ پھر عین پرست کہتا: روشنی چڑھتی ہے اور ڈھلتی ہے۔ صبح کے وقت رنگ بہتیں اور جلوہ دکھاتا ہے، اور رات کو اور پھر کون سا رنگ اصلی ہے؟ حیوانی اور انسانی بصارت میں اختلاف عظیم ہے۔ پھر کون اشیاء کا صحیح ادراک کرتا ہے؟ وجود کی بے بسی کا تو یہ حال ہے کہ آنکھ کے ڈھیلے کو ذرا دباؤ تو نیلگوں تارے آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔ یرقان اصغر

کامرٰیفس ہر شے کو نسبتی جلوہ میں دیکھتا ہے۔ پھر ہاتھوں کو آزماؤ۔ جن کو تم لمس کا سنگھم سمجھتے ہو۔ ایک ہاتھ گرم پانی میں ڈالو، اور دوسرا سرد پانی میں۔ پھر دونوں نیم گرم پانی میں ڈالو۔ گرم پانی والا ہاتھ خنکی محسوس کرے گا اور سرد پانی والا ہاتھ گرمی۔ آخر ان "جاہل عالموں" پر اعتماد کر کے کوئی کیونکر صداقت کو پا سکتا ہے۔ انسانی حِس و ادراک کا تخالف بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ایک چیز کو زید ایک نظر سے دیکھتا ہے تو بکر دوسری نظر سے"۔

عین پرست اپنے زورِ بیان پر مسرور ہوتا ہے، پھر مادیّت پر آخری ضرب لگاتے ہوئے کہتا ہے: "یہ زاویہ ہی تو ہے جو نظر کو روشنی، کان کو آواز اور ہاتھ کو لمس بخشتا ہے۔ یہی اشیاء کا خالق ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ تھکے ماندے مسافر کے لئے ایک گز بھی ایک میل کے برابر ہے۔ اور منتظر عاشق کے لئے ایک دقیقہ بھی سال سے بڑھ کر ہے"۔

اب مَیں نے اپنی تحقیق فوراً پر ختم کی اور عملی دنیا میں داخل ہوا چاہتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مجھے اس دلیل کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا کہ "دنیا کی ہر چیز نامکمل ہے۔ اور اپنی تکمیل کے لئے اپنا جوڑا چاہتی ہے۔ دو ہاتھ مل کر ایک کام کرتے ہیں، اور دو پاؤں کی حرکت سے ایک قدم اُٹھتا ہے"۔

جب پہلی بار مَیں نے اپنی بیوی دیکھی تو مَیں کچھ وقفہ کے لئے مبہوت رہ گیا۔ وہ باغِ اِرم کی پری تھی یا صبحِ بہار کی پہلی کلی۔ مَیں نے اُسے روکنا چاہا۔ لیکن کوئی آ گیا

مَیں نے پھر کتاب اُٹھالی اور اس میں اپنی توجہ کو جکڑنا چاہا لیکن نہیں میری آنکھوں کے سامنے الفاظ ناچنے لگے۔ اور پھیلتے پھیلتے اس کی تصویر بن گئے۔ دل میں ایک جذبہ بگولے کی طرح اُٹھ رہا تھا۔ مَیں نے آنکھوں کے سامنے دلیل پیش کی کہ وہ حقیقت میں فواد کی تخلیق ہے۔ لیکن آنکھیں تھیں کہ ماننے کو تیار نہ تھیں۔ اور کتاب سے بدستور بھاگ رہی تھیں۔

مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ میرے سامنے پھر کھڑی تھی۔ وہ میری طرف سیاہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، میں کچھ عرصہ تک عالمِ سکوت میں ڈوبا رہا۔ مجھے محسوس ہُوا۔ گویا کائنات کچھ وقت کے لئے ساکن کھڑی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر فواد کی طرف . . . . پھر آنکھوں کو ٹٹولا ہر چیز اپنی جگہ پر قائم تھی۔

"دور ہو مادہ پرست اور عین پرست۔ مادہ اور فواد دونوں قایم ہیں" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا جس نے مجھے اس بھول بھلیوں سے نکالا۔

اب میں اس بات پر یقین واثق رکھتا ہوں کہ ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر نامکمل ہے ٭

چور

چور کسی شکار کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔

ایک شخص بنک کے دروازے پر کھڑا نوٹ گن رہا تھا، جونہی چور نے اس کی طرف رُخ کیا، اس نے جلدی سے تمام نقدی بٹوے میں ڈال لی، اور قریب سے گزرتے ہوئے تانگے پر اچھل کر بیٹھ گیا۔

ایک خوش لباس شخص چوک کی بڑی بڑی دکانوں کے سائن بورڈ پڑھ رہا تھا۔ وہ ہر دکان کو بڑے غور سے دیکھتا۔ پھر کپڑے کی ایک دوکان میں داخل ہوا کچھ عرصہ کے بعد بغل میں ایک بڑا سا بنڈل دابے باہر نکلا۔ اور رنیاری بازار کی طرف ہو لیا۔ یہ بازار بڑا پُر رونق تھا، اور زیورات کی بڑی بڑی دوکانوں کے لئے مشہور تھا۔ چور اس شخص کے قریب پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ اس کی ہر حرکت کو خوب غور سے

دیکھ رہا تھا، اس نے پہلے بنڈل کو ٹٹولا۔ پھر اپنی اندرونی جیب کو۔ اس کے بعد رومال نکال اپنے چمکیلے بوٹوں کو جھاڑا۔

بازار کے عین وسط میں تانگے کا ایک پہیّہ نالی میں گر گیا تھا، چونکہ بازار عرض میں کم تھا۔ اس لئے گذرنے والوں کا ایک مجمع لگ گیا۔ چند ایک منچلے کوٹ اتار پہیّے پر اپنی زور آزمائی کر رہے تھے۔ باقی کھڑے دیکھ رہے تھے، یہ خوش لباس شخص بھی کھڑا ہو گیا۔ چور کے لئے یہ موقعہ غنیمت تھا، وہ بھی اس کے برابر آن کھڑا ہوا۔ ابھی چور نے اپنا ہاتھ اس کی جیب کی طرف بڑھانا ہی چاہا تھا۔ کہ وہ تنک کر بولا۔ "اندھے ہو گیا، دیکھتے نہیں، پاؤں پہ پاؤں دھرے جا رہے ہو، نامعقول" چور فوراً کھسک گیا۔

اب چور بازار میں پھر آوارہ گھوم رہا تھا۔

بازار کے ایک سرے پر ایک کھولی ہوئی رگوں والا بوڑھا چھابڑی فروش گنڈیریاں بیچ رہا تھا۔ اس کی بصارت کم معلوم ہوتی تھی، چار پانچ بچے اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے چلا رہے تھے "بابا پہلے مجھے تول دو، بابا پہلے مجھے تول دو۔" اور بابا اپنا بھیگا سا سر ہلا کر کہتا "میں سب کو پہلے تول دوں گا" جب بچے چلے گئے تو اس نے اپنی جیب ٹٹولی، صرف ایک آنہ باقی رہ گیا تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ اس اکنّی ہی سے کچھ بیوپار کیا جائے۔ چنانچہ وہ بوڑھے کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"ایک آنہ کی گنڈیریاں"۔

بوڑھے نے نہایت خوشی کے ساتھ گنڈیریاں تول دیں اور اکنّی لے لی
چور کچھ دیر کھڑا گنڈیریاں چوستا رہا، پھر یکایک بوڑھے سے کہا "بابا! باقی تین
آنے نہیں دو گے"؟

"وہ کیسے"؟ بوڑھے نے تعجب سے پوچھا۔

"میں نے تم کو چونّی دی تھی"۔

"نہیں نہیں" بوڑھے نے تیزی سے کہا "تم نے چونی کب دی تھی"؟

"یہ دیکھو! میری چونّی" چور نے بٹوں کے نیچے پڑے ہوئے سکوں میں سے
ایک چونّی کی طرف اشارہ کیا۔

بوڑھا تذبذب میں پڑ گیا۔ پھر خود ہی بولا "اوہ! مجھ سے بھول ہو گئی۔ یہ لو
تین آنے"۔

چور نے تین آنہ تو لے لئے لیکن اسے اس بیوپار کا لطف نہ آیا، اس کا
جی چاہتا تھا، کہ وہ کسی خطرہ میں گھر جائے۔ اور پھر اس سے صاف بچ نکلے۔
چنانچہ اس نے پھر منیاری بازار کا رُخ کیا۔

ایک دیہاتی اُجلے کپڑے پہنے زیورات کی دکان کے اندر جھانک رہا تھا۔
ایک دکان میں داخل ہوتا، کچھ زیورات دیکھتا۔ لیکن ناک بھوں چڑھا کر پھر باہر
نکل آتا، وہ اپنے آپ کو بہت چالاک گاہک ظاہر کر رہا تھا۔ ایک دکاندار کے

قریب جاتا اور بلند آواز سے کہتا " لالہ جی! سونے کا کیا بھاؤ ہے؟ جڑائی کا کیا لیتے ہو؟" وغیرہ وغیرہ، پھر کچھ دیر پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر دوسری دوکان کی طرف چل دیتا۔" تیار شدہ چار تولے کے کنگن کا کیا لوگے؟ چور بڑے انہماک سے اس کی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ کسی بیاہ کے لیئے زیور خریدنا چاہتا تھا۔

آخرکار وہ ایک دکان میں داخل ہوا، اور دکاندار سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ دکاندار نے کنگنوں، چوڑیوں، جھمکوں اور پری بندوں کے مختلف نمونے اس کے سامنے پھیلا دیئے۔ وہ ایک ایک چیز کو اٹھاتا اور اپنی ناک کے قریب لیجاکر غور سے دیکھتا۔ پھر اس کے متعلق پوری واقفیت حاصل کرنے کے لیئے دوکاندار پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا، پورے دو گھنٹے میں اس نے آٹھ تولے سونا خریدا، اور قیمت ادا کرنے کے لئے ایک بڑا سا بٹوا نکالا۔ اور اس کو میز پہ الٹ دیا پھر تمام روپیوں کو ڈھیر کر دیا، اور ایک ایک کر کے دوکان دار کی طرف پھینکنے لگا۔

چور بجلی کے کھمبے کے ساتھ کھڑا کھڑا تھک گیا تھا صبح سے اس نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ اس لیئے اب اس کی ٹانگوں میں تھکن سے سوئیاں چبھنے لگیں، وہ گنڈیریوں کو چبا چبا کر چوستا اور چھلکوں کو زور سے زمین پر دے مارتا۔ دیہاتی نے خریدنے میں اتنی دیر لگادی کہ چور قریب قریب مایوس ہو گیا۔ کافی عرصہ کے بعد جب چور نے جانے کے لئے قدم اٹھائے، تو وہ دکان سے باہر نکلا، اس نے سونے کی پوٹلی کو کمر سے لپیٹ لیا۔ چلتے چلتے وہ بار بار اپنی کمر کو ٹٹولتا، اور پیچھے

مڑ مڑ کر دیکھتا۔

چور بھی پیچھے پیچھے ہو لیا، چلتے چلتے وہ شہر کی بیرونی سڑک پر پہنچ گئے، جہاں سے مختلف دیہاتوں کو راستے پھوٹتے تھے، یہاں میلے کچیلے ہوٹلوں کی ایک لمبی قطار تھی، جن کے باہر کتے روٹی کے ٹکڑے ڈھونڈھ رہے تھے۔ اس کے اخیر پہ یکوں کا اڈا تھا، اور اس کے عقب میں ایک دیسی شراب کی دوکان۔ جب دیہاتی اس دکان کے سامنے پہنچا، تو وہ ٹھٹک گیا، اس نے ایک نگاہ دکان پر ڈالی جس کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر ایک موٹی توند والا "لالہ جی" بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ایک نوجوان پگڑی کو گردن میں مفلر کی طرح لپیٹے اونگھ رہا تھا، دکان کے اندر شراب کی بوتلیں قطار اندر قطار الماریوں اور طاقوں میں لگی ہوئی تھیں۔ جن کے کارک مٹی سے زرد ہو گئے تھے۔

دیہاتی نے ایک قدم آگے کی طرف بڑھایا، لیکن پھر رک گیا، کچھ لمحات کی کشمکش کے بعد وہ مڑا اور دکان میں داخل ہو گیا، لالہ جی توند کے باوجود اچھل کھڑے ہو گئے، اور اس کے پیچھے اندر گھس گئے، اب چور پھر سڑک کے کنارے لگے ہوئے ببول سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سورج کی تپش کافی حد تک سرد ہو چکی تھی، لیکن سڑک پہ ابھی تک یکوں کے غبار کی ایک لمبی لکیر کھنچی ہوئی تھی، کچھ یکے ابھی کھڑے تھے، یکّے والے میلے کچیلے لباس میں ملبوس ہر اجنبی پر ٹوٹ پڑتے۔

"چودھری جی ڈھولن ادھر"۔ ساہو والا"، بھوانی پور" مریل گھوڑے کھڑے کھڑے

اونگھ رہے تھے، چور نے آخری گنڈیری چوسی اور چھلکا پھینک کر اسے پاؤں تلے مسل دیا۔

خلافِ توقع دیہاتی جلدی شراب خانے سے نکل آیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اور آنکھیں نیم وا۔ اس نے دکان کی دہلیز پر کھڑے ہو کر چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور اپنے گاؤں کی سڑک پر ہو لیا۔

سڑک کے دونوں جانب سرسبز گندم اور سرسوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ سورج اب مغرب کی طرف قدم اٹھا رہا تھا، ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ دیہاتی کا ہاتھ بدستور اپنی کمر پر تھا، اور وہ سبک رفتار چلنے لگا، کبھی کبھی اپنے دائیں بائیں دیکھ لیتا، اور اور پھر سر جھکائے بگ ٹٹ چلا جاتا۔ کچھ دور تک سڑک کافی چوڑی تھی، لیکن جوہڑ کے قریب اس کی چوڑائی کم ہو گئی تھی۔ یہاں سڑک کا عرض بمشکل دس قدم ہو گا۔ جوہڑ تک کوئی اکا دکا نظر آ جاتا۔ لیکن اس سے پرے بالکل سناٹا تھا، چور بیس قدم کے فاصلہ پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چلا آ رہا تھا، اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن کوئی متنفس دکھائی نہ دیا، وہ دل ہی دل میں خوش ہوا۔ حالات سازگار تھے اس نے سوچا، اگر وہ اسے چاقو دکھا کر سونا لوٹ لے تو مدد پہنچنے سے پہلے پہلے وہ بڑی آسانی سے فرار ہو سکتا ہے، اس نے جیب سے بڑے پھل والا چاقو نکالا۔ اور تیز قدم بڑھا، قریب ہوا، کارروائی سے پیشتر اس نے ایک بار پھر حول کو جانچا، ہر چیز ٹھیک تھی، وہ جست لگا کر اس کا راستہ روکنے ہی والا تھا، کہ

نزدیکی کھیت سے کھنکارنے کی آواز آئی۔ اُس نے جلدی سے چاقو چھپا لیا، ایک کسان پھاوڑا اُٹھائے کھالے کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔

سڑک سبز گندم کی دیواروں کے بیچوں بیچ بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی ہوا سرسوں کی ہلکی ہلکی خوشبو سے لدی ہوئی تھی۔ اور گندم کے سبزے پر ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں لہریں لے رہی تھیں۔ راستہ بالکل خالی تھا، اور مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار کسی پرندے کی چہچہاہٹ سنائی دیتی، اور پھر سے ایک پرندہ جھاڑی سے اڑ نکلتا، چور نے جیب سے پھر چاقو نکالا، اور اپنے آپ کو مستعد کیا ابھی وہ دیہاتی کے نزدیک ہوا ہی چاہتا تھا کہ دُور سے کسی لڑکے کے بے سُرے گیت کی آواز سنائی دی، دیہاتی کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاؤں میں ببول کا کانٹا چبھ گیا۔ "جس طرف دیکھو کانٹے ہی کانٹے" دیہاتی بڑبڑاتا ہوا پھر چلنے لگا، اتنے میں سامنے سے گدھے پہ سوار راگی لڑکا نمودار ہوا۔ اس نے چھوٹی سی تہبند باندھی تھی، اور پھٹا ہوا کرتا پہنا ہوا تھا۔ وہ پورے زور سے اپنا گلا پھاڑ رہا تھا۔

"گیا بھج تقدیر دے نال ٹھوٹھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ ماحول سے بالکل بے پروا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ دیہاتی اور چور کے قریب سے گذرا، تو بھی اپنی آواز کو پست نہ کیا، اس کی آواز انجن کی کرخت سیٹی کی طرح چور کے کانوں میں چبھی، چور نے اس پر لعنت بھیجی اور چاقو پھر چھپا لیا۔

لڑکے کے عقب میں خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ آ رہا تھا۔ اونٹوں کی لمبی

قطار ساکن پانی کی لہروں کی طرح چلی آ رہی تھی۔ ان کے گلے کی گھنٹیاں مدھم بج رہی تھیں، اور قافلہ کے پیچھے دور تک غبار کی دھند سڑک پر چھائی ہوئی تھی۔

چور سٹپٹایا، کیونکہ سورج اب افق پر پہنچ چکا تھا، گہری سُرخ روشنی تمام آسمان پر پھیل رہی تھی، اور پرندوں کے غول اپنی پناہ گاہوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ دیہاتی اسی رفتار پر مست فیلِ بے زنجیر کی طرح جھومتا جا رہا تھا۔ "لعنت ہو مجھ پر" چور نے اپنے دل میں کہا "میں ایک پرندے سے بھی کمزور ہوں شام ہو رہی ہے اور شکار ہاتھ سے جا رہا ہے۔" یہ سوچتے ہوئے وہ ایک بار پھر آگے بڑھا، اور واقعی وہ دیہاتی کو جا لیا، لیکن جونہی اس نے دیہاتی کو بازو سے پکڑا اس کے کانوں میں رہٹ کی آواز آئی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" دیہاتی نے تیزی سے پوچھا۔

"میں غریب الوطن ہوں۔ یہ سڑک کس گاؤں کو جاتی ہے؟"

"کس گاؤں کی طرف جاتی ہے؟!" دیہاتی بڑبڑایا، "تم خود ہی دیکھ لو گے"۔

رہٹ چل رہا تھا۔ اور اس کے چکر سے عجیب قسم کی دردناک چیخیں نکل رہی تھیں چور نے غضب ناک نگاہوں سے رہٹ کی طرف دیکھا۔ "خدا تیرے پانی کو کھاری کر دے" اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا، سورج اب ڈوب چکا تھا۔ اور کھیتوں پر سیاہی مائل سبزی چھا رہی تھی، سامنے گاؤں کی دھندلی تصویر کھڑی تھی۔ چور پر انتہائی مایوسی چھا گئی۔ وہ پلٹ کر جانا ہی چاہتا تھا، کہ اُس کی نظر دیہاتی پر پڑی، جس کے

قدم اب زیادہ لڑکھڑانے لگے تھے۔ ایک بار پھر اس نے اپنے عزم کو سنبھالا۔ اور اس کے پیچھے گھر تک پہنچ گیا۔

گلی میں کافی اندھیرا تھا۔ دیہاتی کا مکان گلی کے عین وسط میں تھا جس کے سامنے کوڑے کرکٹ کا انبار لگا ہوا تھا۔ دیہاتی نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی ایک گہرا سانس لیا، اور اپنے پیچھے دروازہ بند کئے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ چور بھی دروازے سے جا لگا، اندر سے ایک رسیلی آواز نے دیہاتی کا استقبال کیا۔ "آپ نے بہت دیر کی"! دیہاتی تھکے ہوئے بیل کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "پانی"

مکان سے اس کے علاوہ اور کوئی آواز نہ آئی۔ شاید دونوں میاں، بیوی ہی رہتے تھے۔ اس لئے چور نے ٹھان لی۔ کہ رات وہیں گذارے اس نے ڈیوڑھی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ دیوار میں ایک طرف اوپلوں یا ایندھن وغیرہ رکھنے کے لئے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی سی بنی ہوئی تھی۔ چور اسی میں چھپ گیا۔

میاں بیوی بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے، لیکن گفتگو کے دوران میں انہوں نے ایک بار بھی سونے کا تذکرہ نہ کیا۔ میاں بیوی اکٹھے کھانا کھا رہے تھے، اور ہنس رہے تھے۔ بیوی اپنے ساٹن کے نئے لباس کی تعریف کرنے لگی۔ دیہاتی اپنا سر ہلا دیتا اور ہر فقرہ کے بعد خوب یا بہت اچھا کہہ دیتا، اس پر نیند رات کی سیاہی کی طرح چھا رہی تھی، کچھ مستی اور کچھ تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی

آواز بھرا گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ صحن ہی میں لیٹ گیا، رات قدرے گرم تھی، اِس لیئے بیوی نے اصرار کیا، کہ چھت پر چل کر سویا جائے۔

"چھت اور صحن میں کوئی فرق نہیں۔" دیہاتی نے سوئی آواز میں کہا۔

"نہیں نہیں اوپر چلیئے۔" بیوی نے کہا۔

مجبور ہو کر دیہاتی اُٹھ کھڑا ہؤا اور کھٹ کھٹ کرتا ہؤا چھت پر چڑھ گیا، بیوی ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنے آئی۔ وہ چور کے اِس قدر قریب سے گذری کہ وہ اس کے سانس کی موسیقی بخوبی سُن سکتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سروں میں کچھ گنگنا رہی تھی۔ اس نے اندھیرے میں سب دروازوں کو ایک دو بار کھٹکھٹا کر دیکھا، پھر وہ بھی چھت پر چلی گئی۔

اب مکمل خاموشی تھی، گلی میں ایک آدھ قدم کی کھٹ کھٹ سنائی دیتی۔ چند لمحات کے لیئے وسیع خاموشی کانپ اُٹھتی۔ اور پھر سکوت طاری ہو جاتا، گاؤں کے باہر کتے لمبی لمبی چیخیں مار رہے تھے۔ چور نے پناہ گاہ سے باہر قدم رکھا اور صحن میں آگیا صحن بالکل چھوٹا سا تھا، اس کی ایک طرف بیٹھک تھی جس کا ایک دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ بیٹھک کے پہلو میں سیڑھیاں چھت پر جاتی تھیں دوسری طرف ایک چھوٹا سا کباڑ خانہ اور ایک محراب دار کمرہ تھا۔

چور نے سب سے پہلے بیٹھک کی طرف توجہ کی، لیکن اس کا دروازہ نہ کھلا۔ چنانچہ بغیر توقف کے محراب دار کمرے کا رُخ کیا۔ اس کی حیرت کی انتہا

نہ رہی، جب دروازہ ایک ہی دھکے کے ساتھ کھل گیا۔ کمرے میں ایک طرف چند صندوق اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے، دوسری طرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا جس کے پہلو میں مٹکوں کی ایک عمودی قطار کھڑی تھی۔ دروازوں کے طاقوں اور چوبی کنگنیوں پر گلاس، کٹورے اور تھالیاں قطار در قطار سجی ہوئی تھیں، چنانچہ سب سے پہلے صندوقوں کی طرف متوجہ ہوا، پہلا صندوق غیر مقفل تھا۔ اس میں چند ایک عام استعمال کے زنانہ کپڑے تھے۔ دوسرا صندوق مقفل تھا لیکن اس کا تالا تھوڑی سی کوشش کے بعد کھل گیا، اس میں کپڑوں اور توشکوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تیسرا صندوق بھی کپڑوں سے بھرا تھا، پورے ڈیڑھ گھنٹے کی طویل جدوجہد کے بعد اس کے ماتھے پر پسینے کے دھارے پھوٹ نکلے، "سونا کہاں ہے" وہ بار بار سوچتا، کمرے کا ایک ایک گوشہ چھان مارا، لیکن سب بے سود وہ کباڑ خانہ میں گیا۔ مگر سوائے ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں اور چند تختوں کے وہاں بھی کچھ نہ تھا، وہ پھر لوٹ کر اسی کمرہ میں آ گیا۔ اب وہ کافی تھک گیا تھا، اس لئے اس نے سوچا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سستا لے وہ انتہائی یاس کی حالت میں دیہاتی پر لعنتیں بھیج رہا تھا، "کون کہتا ہے کہ دیہاتی بھولے ہوتے ہیں، یہ بدمعاش تو چوروں کے بھی کان کترتے ہیں۔" وہ پلنگ پر دراز ہو گیا۔ لیکن لیٹتے ہی اس نے محسوس کیا، گویا کوئی ڈھیلا پلنگ پر رکھا ہوا ہے، جب اس نے بستر ٹٹولا تو اس کے ہاتھ میں سونے کی پوٹلی تھی۔

چور کا جی زور سے قہقہہ لگانے کو چاہا" شاباش بچے، تو ذرا دیہاتی ہی نکلا۔ شاباش!"

وہ صحن میں آگیا، آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ وہ دیہاتی زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ دور کسی مرغ نے اذان دی "کیا صبح ہو گئی؟" چور نے آسمان پر نظر ڈالی۔ آسمان ابھی تاریک تھا، اور صبح کی کوئی نشانی ظاہر نہ تھی۔

اس نے جلدی سے دروازے بند کئے اور ڈیوڑھی میں آگیا۔ جب ڈیوڑھی کا دروازہ کھولنے لگا، تو اس کا ہاتھ ایک مضبوط قفل پر جا پڑا۔ اُس نے جیب سے چابیاں نکالیں، اور ان کو ایک ایک کر کے آزمانا شروع کیا۔ لیکن کوئی نہ چلی۔

"اف میں تالا توڑنے والا اوزار بھی بھول آیا ہوں"

اب جسمانی طاقت کی آزمائش کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے ایک پاؤں دروازے پر رکھا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اس کو کھینچا۔ مگر تالا ٹس سے مس نہ ہوا، وہ اسی طرح مضبوطی سے لٹک رہا تھا۔ اُس نے پھر زور آزمائی کی لیکن پاؤں رپٹ گیا۔ اور وہ دھم سے نیچے آرہا۔ اس کا سر زور سے بیٹھک کے کواڑ پر لگا۔ اور ایک ایسا کھٹا کا ہوا کہ سارا گھر گونج گیا۔

ابھی چور بمشکل سنبھلا ہی ہوگا کہ میاں بیوی سیڑھیوں سے کھٹ کھٹ نیچے اتر رہے تھے۔

میاں بیوی اُترتے ہی سیدھا محراب دار کمرے میں داخل ہو گئے، چور کے لئے

یہ سنہری موقع تھا۔ وہ ڈیوڑھی سے نکلا اور سرعت سے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

"چور! چور!" دیہاتی پھٹے ڈھول کی طرح چلایا۔ اور لپک کر اُس کے پیچھے آیا۔

چھت زیادہ بلند نہ تھی، اِس لئے چور نے گلی میں چھلانگ لگا دی، ابھی وہ دوسری گلی کے موڑ تک ہی پہنچا تھا کہ تمام گاؤں بیدار ہو گیا، دیہاتی بدستور چلا رہا تھا "چور چور" ہر طرف سیڑھیوں سے کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں "پکڑو، پکڑو، جانے نہ پائے" کی صدائیں بلند ہونے لگیں، ان کے ساتھ کتے بھی ہم آہنگ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا مدت سے بند مشین یکایک چلنے لگی۔

چور گلیاں طے کر کے گاؤں کی سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ گاؤں کی عمارتوں سے روشنیاں نمودار ہونے لگیں! عورتیں چیخ رہی تھیں، بچے رو رہے تھے گلیوں میں لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ رات تاریک تھی۔ چور نے سوچا، کہ وہ کسی کھیت میں گھس جائے، لیکن پھر اُسے خیال آیا، کہ اس صورت میں تو وہ اپنے آپ کو ان کے زغہ میں دے دیگا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ انہیں دھوکا دے کر شہر کا رُخ کرے، تعاقب کرنے والے ابھی گاؤں سے نکلے ہی تھے، کہ وہ قریب کے کھیت میں گھس گیا۔

"وہ جاتا ہے" ایک چلایا، اور اس کے پیچھے تمام لوگ کھیتوں میں گھس گئے چور اوپر سے چکر کاٹ کر سڑک پر آگیا۔ لیکن عقاب چشم لوگوں نے اسے پھر پا لیا

اب گاؤں کے چاروں کونوں سے مشعلیں اس کے تعاقب میں دوڑ رہی تھیں۔

سڑک کھیتوں کے درمیان بل پیچ کھاتی جا رہی تھی۔ پہلے میل کے نشان پر سڑک دو شاخوں میں بٹ رہی تھی۔ ایک شہر کو جاتی تھی، اور ایک دریا کو، چور نے آتے وقت اِس چیز کی طرف کوئی دھیان نہ دیا تھا، اب وہ عجیب مخمصے میں گرفتار تھا، وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ شہر کو کونسی سڑک جاتی ہے۔ اور دریا کی طرف کونسی! مشعلیں اور چیخیں اس کی طرف سرعت سے بھاگی چلی آ رہی تھیں، اندھیری رات میں یوں دکھائی دیتا تھا، گویا بھوتوں کا کوئی قافلہ چیختا چلاتا آ رہا ہے۔ سوچنے کے لئے کوئی وقت نہ تھا۔ وہ دائیں سڑک پر ہولیا۔ تھوڑی دُور ہی گیا ہوگا کہ دریا کی سرسراہٹ اس کے کانوں میں پڑی، اس کا کلیجا دھک سے رہ گیا، اب وہ پیچھے نہ مڑ سکتا تھا۔ چور کے لئے اب اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ کہ یا تو وہ دیہاتیوں کے جال میں پھنس جائے یا تیر کر دریا عبور کرے۔ اُس نے آخری فیصلہ کو قبول کیا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ لیکن جونہی وہ پانی میں اُترا، اُس نے محسوس کیا، کہ اب صرف دو ہی صورتیں رہ گئی ہیں۔ یا تو وہ اپنے آپ کو دیہاتیوں کے حوالے کر دے، یا دریا میں جان بحق ہو جائے۔

مشعلیں اور چیخیں طوفان کی طرح بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ چور نے انتہائی یاس اور حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا، یکایک اس کے دماغ میں ایک بجلی سی کوندی۔ اس نے اپنے تمام کپڑے اتار کر دریا میں پھینک دیے اور اپنے عریاں

جسم پر خاک مل کر آلتی پالتی مار زمین پر بیٹھ گیا۔ اور اللہ ہو کی ضربیں لگانے لگا۔

لوگ اب بالکل قریب پہنچ گئے تھے، وہ جھاڑیاں پھلانگتے درختوں کی شاخیں توڑتے چلے آرہے تھے مشعلوں کی سُرخ روشنی میں ان کے برچھے سانپوں کی لاتعداد زبانوں کی طرح چمک رہے تھے۔

"پکڑ لو! وہ بیٹھا ہے۔"

لوگ دیوانے کتوں کی طرح اس کی طرف لپکے۔

چور بدستور اللہ ہو اللہ ہو کی ضربیں لگاتا رہا، لوگ اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

"ارے یہ تو کوئی اللہ کا بندہ ہے، اس کو کیا کہتے ہو۔" ایک نے مشعل بلند کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں بابا سائیں تم نے یہاں سے کسی کو گذرتے دیکھا ہے۔"

چور نے بدستور آنکھیں بند رکھیں: "اللہ ہو۔"

لوگ جواب کا انتظار کئے بغیر بھاگ اُٹھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

چور نے آنکھیں کھولیں، سیاہ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے، اس نے اپنے جسم پر نگاہ ڈالی۔

اُسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے جسم سے لاکھوں من بوجھ اتر گیا ہے

اس کا دل ہلکی پھلکی مسرت میں کلبلیں کر رہا تھا۔ پھر اُسے یاد آیا، کہ کپڑوں کے ساتھ سونے کی تھیلی بھی پانی میں بہہ گئی تھی۔ اِس خیال سے اس کا دل اور بھی ہلکا ہو گیا بہت دیر تک وہ اِسی طرح مراقبے میں بیٹھا رہا۔ اس نے پھر سر اٹھا کر آسمان پہ نظر دوڑائی۔ اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اس کے سینے سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے، اللہ ہو —"

احوبہ

یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟

جبکہ سورج آسمان کے وسط سے نیچے ڈھلک رہا ہے، اور فرات کی روپہلی لہروں پر ڈھونگے اور مچھوے نرم رو نسیم کی مانند تیر رہے ہیں۔ بابل کی گلیوں سے روشن چہروں والے لوگ باہر نکل رہے ہیں اور اس کی شاہراہوں کی خوش آہنگ آبادی اپنے پیچھے ایک سناٹا بکھیرتی چلی جا رہی ہے۔ عورتیں فراط کے گر نگے اور دریائی چاندی کے زیور پہنے کھلکھلاتی جا رہی ہیں۔ نوجوانان بابل ریشمی عبائیں اوڑھے ان کی طرف کنکھیوں دیکھ رہے ہیں۔ سب ایک ہی حرکت کے ساتھ جا رہے ہیں۔ گلیوں سے باہر، بازاروں سے باہر، شاہراہوں سے باہر، باہر فرات کے کنارے کھلے میدان میں جہاں بابل کا سالانہ جشن اپنا خراج مسرت ان سے وصول

کرے گا۔ اس دن عورت مرد کا انتخاب کرے گی اور مرد عورت کا، چاندی کا ایک سکہ ہی کافی ہوگا اور مطلوب طالب کی جھولی میں ہوگا۔ دریائی سرکنڈے کی بانسری کے نغمے فضا کے دوش پر تیر رہے ہوں گے۔

"لے لو شبِ فردوس کے پھول! اگر تمہاری محبوبہ فرقت میں روتی اور ہنگامِ وصل ہنستی ہے تو نجم شب اس کے لئے مناسب ہے۔ اور اگر وہ تمہارے بازوؤں میں آنسوؤں کے موتی پروتی ہے تو ہلالِ قلب اس کو بحال کر دے گا۔"

بوڑھے پھول فروش نے ایک نوجوان کو دیکھا جو ایک نازنین کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ جھپٹ کر اس کی طرف بڑھا۔ "آنکھوں کی ٹھنڈک جوان! اگر تمہاری محبوبہ ان دونوں صفات سے عاری ہے تو فغانِ سحر لے لو۔"

بوڑھے کی خوشامد آمیز مسکراہٹ اس کی آنکھوں تک پھیل گئی۔ نوجوان نے زمین پر تھوکا اور اس کی طرف دیکھے بغیر چل دیا۔

کھلے میدان میں انسانوں کا بوقلموں ہجوم متحرک تھا شمس دیوتا کی قربان گاہ کی طرف اچھوتے بیل ہانکے جا رہے تھے۔ جن کے سفید چمڑے سورج کی طلائی تابش سے سرخ ہو رہے تھے۔ اور قربان گاہ پر شمس دیوتا اس خون کو غضب کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جو زخم گردنوں کی خنیجوں سے رستے رستے ایک ندی کی شکل میں بہنے لگا۔ اس کا چہرہ ابھی تک تمتا رہا تھا۔ قربان گاہ کے پیچھے بابلی راہب لمبی لمبی عبائیں پہنے اپنی جھولیوں میں دریائی پھولوں کے ڈھیر لئے مقدس راگ گا

رہے تھے۔ ان کی طویل گھنگھریالی لٹیں ان کے شانوں پر سانپوں کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ اور لمبی داڑھیاں فرات کی لہروں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ ان کے سر مذہبی جنون اور سرگشتگی سے بید مجنوں کی طرح کانپ رہے تھے اور پسینے کی پتلی لکیریں ان کی چندیاؤں سے پہاڑی چشموں کی طرح پھوٹ رہی تھیں۔ ان کی لرزتی ہوئی ہم آہنگی فضا میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح پھیل رہی تھی۔

ڈونگے اور مچھوے پانی پر دوشیزہ کی آوارہ آنکھوں کی طرح تیر رہے تھے۔

اور بابل مکینا روں کے سائے خاکی زمین کو چوم رہے تھے۔

"مجھ کو بن دیوتا کی قسم میں اپنا پہلا بچہ اس کی نذر کر دوں اگر وہ آہو چشم مجھے مل جائے"۔ ایک گھنی مونچھوں والا اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

"صرف ایک شب کے عوض، میں اس کے گیسوؤں کے ڈنگ سے اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔ صرف ایک شب کے عوض، شام کی پہلی سیاہ دھاری سے سحر کی پہلی سفید دھاری تک" دوسرے نے آہ سرد بھر کر کہا۔

ہجوم شہر سے مکڑیوں کی طرح نکل رہا تھا اور باہر کی طرف جا رہا تھا ہجوم پہاڑیوں کے بل دار راستوں سے چیونٹیوں کی طرح اتر رہا تھا۔ اور باہر کی طرف جا رہا تھا۔ ہجوم مرغزاروں اور وادیوں سے تیتریوں کی طرح اڑتا آ رہا تھا اور باہر کی طرف جا رہا تھا جہاں فرات کا دیوتا عقیدت کے پھول قبول کر رہا تھا۔ پانی کے کنارے اُمیدوں بھرے ہاتھ اپنی بھینٹیں لئے پھیلے ہوئے تھے۔ پانی کی لہر جو نئی آتی ہاتھوں سے

پھول چھوٹ جاتے اور دیوتا منہ پھاڑ کر انہیں نگل لیتا۔ یکایک ایک دردناک چیخ اٹھی اور ایک عورت سسکیاں بھرتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے پھول کیچڑ میں دھنسے رہ گئے۔ اور موج ایک کف آلود سرسراہٹ کے ساتھ لوٹ گئی۔

"ابھاگنی"

عورت کے شانے پر ایک مضبوط ہاتھ پڑا۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اُٹھا کر دیکھا۔ اس کے پیچھے فرات دیوتا کا راہب کھڑا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ اور اس کی چاند دھوپ میں چمک رہی تھی۔

"تم بیوہ ہو؟"

"ہاں مقدس باپ" اس نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

"تم معبد میں کتنے برس رہ چکی ہو؟"

"دو برس"

"تمہارا وہی ٹھکانہ ہے۔"

عورت نے پلّو میں منہ چھپا لیا۔ لیکن اس کی سسکیاں اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے کھسک گئیں۔ اس کا چہرہ گلاب سے لالہ بن گیا۔ اس کا جسم فرات و دجلہ کے مقدس پانیوں سے دھلا ہوا تھا۔ جونہی وہ چلی راہب کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ گویا ہوس کی چنگاری سے۔

سورج پہاڑیوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ اور بابل کے میناروں کے سائے

فرات کے کناروں کو چھوڑ رہے تھے۔ میدان میں مشعلیں رات کی لاتعداد آنکھوں کی طرح روشن ہو رہی تھیں۔ اور انتخاب کی منتظر عورتیں کٹہروں سے لگی کھڑی تھیں۔ قہقہے اور گیت فضا میں تھرتھری پیدا کر رہے تھے! بابل مکمّل سناٹے میں کھڑا تحیّر سے اس میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں اس کا سارا شور منتقل ہو چکا تھا صرف ایک جواں سال لڑکا تھا۔ جو مکانوں کے سایوں کی آڑ لیتا ہوا اس کی تنہا و سنسان گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ معبدِ عظیم کے سامنے رُک گیا جس کے اندر ایک صد ایک طلائی بتوں کے سامنے مقدّس آگ کے شعلے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور اس کے ستونوں کے درمیان عنبر و عبیر اور خوشبودار عود کی لپٹیں چکر لگا رہی تھیں۔ وہ بے دھڑک اس بُت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جو سب بتوں کے وسط میں تھا۔ اور اپنی ہیئت و حجم سے ان کا سردار معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے لڑکے کی اس جسارت آمیز گستاخی پر اُسے اپنی سُرخ زمردی آنکھوں سے گھورا۔ لڑکا بدستور بے خوف اس کی اور اس کے ننھے منّے چلبلے دیوتاؤں کی طرف دیکھتا رہا جن کے طلائی جسموں پر مقدس شعلوں کے سائے زیر و بم کھیل رہے تھے۔

"تم مجھے کائنات اور اس کے اندر بسنے والی زندگی کی حقیقت سے آگاہ کر سکتے ہو؟ یہ سب راز کیا ہے؟"

بڑے دیوتا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے ایسا سوال نہ کیا تھا۔ ہمیشہ لوگ آتے۔ سر جھکائے ان کی حمد و ثنا کرتے اور گڑگڑا کر

اس کے سامنے اپنی پوشیدہ آرزوئیں ظاہر کر کے چل دیتے کبھی کسی نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ پھر یہ کون تھا جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے یہ سوال پوچھ رہا تھا۔ اور اس کے علم کی گہرائی جانچ رہا تھا، بڑے دیوتا کی آنکھوں کی سُرخی شعلوں کی مانند گہری اور چمکدار ہو گئی۔

"تم مجھے اِنسانی خلقت کا راز بتا سکتے ہو؟"

تہوار کے قہقہے پانی کی موجوں کی طرح اُچھلے۔ اب کے دوسرے دیوتاؤں کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایک گستاخ اور منہ پھٹ لڑکا ان سے ایسے سوالات پوچھے جن کا خود انہیں بھی سان وگمان نہ ہوا تھا۔

"تم مجھے بتاؤ گے یا نہیں؟" لڑکے نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ "کتنے عرصے سے میرا دل بے قرار ہے کہ میں معلوم کروں کہ یہ سب شور کیسا ہے؟ میری آنکھیں گھومتی ہیں اور اپنے گرد رنگوں کی قوس قزح اور صورتوں کی بوقلمونی دیکھتی ہیں۔ میرے کان صوت کے تال و تناسب سے بھر جاتے ہیں۔ وہ کیا ہے جس سے ان میں شیرینی و تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عالمِ آہنگ و رنگ! مجھ کو بتاؤ یہ کیا ہے کہ جب میں آنکھیں موند لیتا ہوں تو میرے اندر کی دنیا ہفت رنگ کی کلی کی طرح کِھل جاتی ہے جس سے نغموں کے سوتے پھُوٹ بہتے ہیں اور رنگ برنگ کے پھول بہار کا دامن تھامے نمودار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب اس طرف سے بھی توجہ ہٹتی ہے تو کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں رہتا! کیا یہ سب کھیل کسی کی کامل توجہ کا نتیجہ

ہے یا یہ ایک وسیع مرض کا بوس ہے۔ جو سب جانداروں کو احاطہ کئے ہوئے ہے؟ میں نے ستاروں کی قندیلوں کو گم ہوتے دیکھا۔ سورج کی طشت کو افق میں ڈوبتے دیکھا اور چاند کے نقرئی حسن کو سورج کی قہرمانی کے سامنے فنا ہوتے دیکھا۔ کیا یہ سب جلال و جمال کی آنکھ مچولی ہے؟ مجھ کو بتاؤ یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں تم سے پوچھ رہا ہوں جس کے سامنے بابل کے ان گنت لوگ اپنی آرزوؤں کو دل کے طشت میں لے کر آتے ہیں میری مشکل بھی حل کر دو۔"

بڑے دیوتا کی زمردی آنکھوں میں شعلے کانپ رہے تھے۔ ننھے منے دیوتا ساکن کھڑے اپنے سرخیل کی بے بسی اور لڑکے کی جسارت پر متعجب ہو رہے تھے۔ آگ میں ایک عجیب قسم کی بے چین سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے شعلے لاتعداد اژدہوں کی زبانوں کی طرح لپک رہے تھے۔

اگر تم میرے سوالات کا جواب نہ دو گے تو میں تم سب کے سر پھوڑ دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی آستین سے ایک کلہاڑا نکالا جس کا پھل آگ کی روشنی میں چمک اُٹھا۔

باہر سے قہقہوں کا شور اُٹھا۔ بڑے دیوتا کی آنکھیں خوف سے بے نور ہو گئیں اور ننھے منے دیوتاؤں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"کوئی جواب نہیں، تو پھر میں تم سب سے باغی ہوں۔ سن لو میں تم سب سے اور تمہارے بنائے ہوئے جہان سے باغی ہوں۔ میں تم سب سے اور تمہارے بنائے

ہوئے جہان سے باغی ہوں" یہ کہہ کر اس نے ایک بہرے سے دیوتاؤں کی گردنیں اتارنا شروع کردیں" انسانی زندگی کو گمراہ کرنے سے بہتر ہے کہ تم نابود ہو جاؤ۔ اگر تم میں بدلے کی جسارت ہے تو اپنی تمام قوتیں لے آؤ۔ اور مجھ کو جو سزا دے سکتے ہو دو۔ ایک ...... دو ...... تین ...... چار ..."

سوائے بڑے دیوتا کے جس کی آنکھوں کی چمک بالکل ہی زائل ہو چکی تھی۔ اُس نے سب کے سر اُتار دیئے۔ پھر اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تمہیں اس کے ذمہ دار ہو۔ چونکہ تم میرے سوالوں کا جواب نہ دے سکے۔ اس لیے مجھ کو یہ کام کرنا پڑا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے اُس کے کندھے پر کلہاڑا رکھ دیا۔

صبح کے وقت لڑکا پکڑا گیا۔ ایک جزام زدہ بڑھیا، جو جشنِ بابل میں شریک نہ ہو سکی تھی نے اس کو معبد سے نکلتے دیکھ پایا تھا۔ بابل میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ہر آنکھ غضب سے شرر بار ہو رہی تھی۔ ان کے خداؤں کی بے حرمتی! آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ پھٹ گئی۔ یک بیک شہر تلواروں کی چمک اور بھالوں کی نوکدار انیوں سے بھر گیا۔ جوش و غضب کے نعرے لگنے لگے۔

بڑے راہب نے غضبناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "لڑکے تم نے یہ کام کیا ہے؟" ہیکل کے اندر چھوٹے بتوں کے سر ٹوٹے ہوئے ناریلوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔

"نہیں یہ تو بڑے دیوتا کا کام ہے۔ اس سے پوچھو۔ جس کے کندھے پر

کلہاڑا ہے۔"

"کبھی بُت بھی بول سکتے ہیں؟" مقدس راہب نے جھنجھلا کر کہا۔

لڑکے نے طنز آمیز نگاہوں سے بوڑھے راہب کی طرف دیکھا۔ وہ وفورِ اضطراب سے اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔ "پھر تم انہیں پُوجتے کیوں ہو۔ اگر وہ تمہارے سوالوں کا جواب بھی نہیں دے سکتے؟"

راہب کی زبان بتوں کی مانند گنگ ہو گئی۔

وہ بھی اس کے سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔ غضبناک ہجوم یہ گستاخانہ رویہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اور انہوں نے اُسے آگ میں زندہ پھینک دیا۔ لیکن وہ بھی راہب اور اُس کے خداؤں کی طرح بے بس ہو کر ٹھنڈی پڑ گئی۔ اس کے بعد اس لڑکے نے، جس کا نام آئندہ نسلوں نے ابراہیم سنا، اپنے خدا کا ایک الگ مسکن وادیٔ غیر ذی زرع میں لا بنایا۔ کیونکہ اس کا خدا آبادیوں سے زیادہ ویرانوں میں بستا تھا۔ یہ معبد ایک سادہ اور کچا مکان تھا جس کی چار دیواری قدِ آدم سے بڑی نہ تھی۔ وہاں عود و عنبر اور لوبان نہ سلگتے تھے۔ کیونکہ اس کا خدا تکلف پسند نہ تھا۔ وہاں کوئی رسم و آئین نہ تھا۔ وہاں کسی قربان گاہ اور بھینٹ کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ اس کا خدا صرف دلوں کی نیاز قبول کرتا تھا۔

جب عالمِ انسانی کا وہ مرکز تیار ہو رہا تھا۔ ابراہیم معمار کا کام کر رہا تھا۔ اور اسماعیل مزدور کا۔ باپ بنیاد چُن رہا تھا۔ بیٹا اُس کے لئے مواد مہیا کر رہا تھا۔

جب دیواریں مکمل ہو چکیں۔ تو باپ نے مسکرا کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کا نور اس کے سینے میں جاگزین ہوا۔ پھر یعقوب و یوسف میں، پھر وہ نور کوہ سینا پر چمکا۔ اور اس کے بعد اسی نور کی مشعل لئے ایک واعظ بے نوا بیت المقدس کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔

اس کے بعد وہ نور کدھر جائے گا۔

۲

یہی سوال تھا جو احوبہ کے فکر پر مسلط تھا۔ اس کا معلّم بوڑھا منجم اپنی آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کئے ستاروں کی طرف دیکھ رہا تھا جو بیت المقدس کے گرم آسمان پر بہار کے سفید پھولوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی بیضوی آنکھیں ستاروں کے اژدہام میں مضطربانہ گھوم رہی تھیں۔ احوبہ کھڑی کھڑی تھک گئی۔ اُس نے محسوس کیا گویا اس کی پنڈلیوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ وہ رصدگاہ کے کٹہرے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں بھی یسوع ناصری کے کلیسا کی بلند صلیب دیکھ سکتی تھیں۔ وہ بوڑھے منجم کی طرف یک بیک جھنجھلا کر مڑی جس کی نگاہیں ستاروں کے جھرمٹ میں بدستور الجھی ہوئی تھیں۔

"اے حکمت کے باپ تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

اس کا بے گوشت ہاتھ اُٹھا اور خودبخود داڑھی پر پھرنے لگا۔

"وہ دو نئے ستارے —— وہ یقیناً سیارے نہیں۔ ان کی روشنی اتنی

تیز، صاف اور مستعد" وہ بڑبڑایا۔ گویا اپنے آپ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

احوبہ نے اس کے الفاظ سُن لئے۔ لیکن اس نے اپنے سوال کو پھر دہرایا۔ اس کے بالوں میں گندھی ہوئی کلیوں کی ہلکی ہلکی خوشبو رات کی گرمی میں تحلیل ہو رہی تھی۔ وہ بے اختیار آنکھیں موند لینا چاہتی تھی۔

" ہوں ہوں ہوں" بوڑھے نے اپنے گھٹے ہوئے سانس کو آزاد کیا۔ "یہ دو ستارے اس سے پہلے آسمان پر نہ تھے۔ عجیب بات ہے ہمیہ چراغ اور کتاب لاؤ۔"

"کون سے ستارے، حکیم السمٰوات؟"

"وہ دیکھو۔" اس نے اپنی انگلی سے اس طرف اشارہ کیا۔ جہاں سلیمان کے نابود ہیکل کی یاد میں ایک پہاڑی رہ گئی تھی۔ اس کے عین اوپر دو ستارے چمک رہے تھے کسی مقدس فرشتے کی آنکھوں کی طرح مستعد یا نوپید غزال کی آنکھوں سے مشابہ۔

حبشن خادمہ زیتون کا چراغ اور چرمی کتاب لئے آ گئی۔ اس کے چہرے کی سیاہی زیتون کی سفید روشنی میں اور بھی گہری ہو گئی۔ "اُف، تُو تو شیطان کی کتیا دکھائی دیتی ہے۔" احوبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بوڑھا منجم اپنی کتاب کے عتیق صفحات اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ وہ کچھ دیکھتا، کچھ پڑھتا۔ پھر آسمان کی طرف نگاہ اُٹھا لیتا۔ احوبہ اس کی لمبی سفید داڑھی کی طرف دیکھ رہی تھی، جو اس کے عمامے کے عین نیچے سینے تک لٹک رہی تھی۔ اس کی بھیگی ہوئی

گھنی بھویں اس کی آنکھوں پر کھجور کی چھتریوں کی طرح سایہ کر رہی تھیں۔ اس کا سفید جبہ اس کے نحیف جسم پر مانگے تانگے لباس کی مانند ڈھیلا ڈھالا ٹنگا ہوا تھا۔

"اس کی سمت؟" وہ یک بیک چلّا اُٹھا۔

وہ ستاروں کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا۔ گویا کسی کو طوفان کے آثار نظر آجائیں اس کی پتلیاں پھیل گئیں۔ دیئے کی سفید لو اس کی آنکھوں میں مقدس روشنی آگ کی طرح ناچ رہی تھی۔ یکایک صحرائی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور دیئے کو بجھا گیا۔ اور وہ دونو اندھیرے میں ستاروں کی طرف تکتے رہ گئے۔

"اے صاحب اسرار نجوم! حوریں تیری داڑھی میں موتی پروئیں، کچھ مجھ کو بھی بتا۔"
منجّم نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ دو ستارے مل کر ایک شعلہ پیدا کرنے والے ہیں۔ جو جہانِ قدیم و فرسودہ کو خاکستر کر کے ایک نئے جہان کو روشن کرے گا۔ یہ کائناتی انقلاب کے آثار ہیں۔"

احوبہ کی غزالی آنکھیں بوڑھے کو حیرت سے تک رہی تھیں۔ اور بوڑھے کا سراپا بیدِ مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔

"بیت المقدس کا نور فاران کی جانب ڈھلک رہا ہے۔ ایک قوت اس شہر کو قصّہ پارینہ بنانے والی ہے۔"

احوبہ کی عبرانی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس کی آنکھوں میں اسرائیلی آگ کا پرتو تھا تھا۔ وہ ایک یہودی رقاصہ کی بیٹی تھی۔ جس کا شہرہ قیصر و کسریٰ کے درباروں میں گونج

چکا تھا۔ اس کی ماں نے ساری عمر بدن کے ہیجانات اور لعل و جواہر کے شعلہ بار سمندر میں گذار دی۔ یہاں تک کہ وہ اس سے اس قدر سیر ہو گئی کہ اس کا دل نفرت اور خوف کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ اگر وہ خوف کی طرف جھک جاتی۔ تو اس کا مقام مسجد اقصےٰ کے کسی محراب کا گوشہ تھا۔ اور اگر وہ نفرت سے متاثر ہوتی تو اپنے ہر محبّ کو ہنگامِ وصل قتل کر دیتی شاید وہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھتی یا شاید اس کے زمرّدی ہونٹوں میں ایسی بے پناہ تلخی اور آگ پیدا ہو جاتی کہ ان سے چھُونے والا ہر ہونٹ خاکستر ہو جاتا۔ اسی فکر میں غلطاں وہ روز بروز زندگی کے ہنگاموں سے دُور ہوتی گئی۔ اس کی آنکھوں کی گرم چمک ٹھنڈی پڑنے لگی اور بیت المقدس کے میخانوں میں رندانِ تیز نگاہ نے اس کے شعلہ آسا حسن میں شبنم کے قطرے جمتے دیکھ لئے۔ اس نے رقص کرنا چھوڑ دیا۔ اور اپنے آپ کو اپنے مکان کی چار دیواری میں مقفل کر دیا۔ دو ہلالوں کے بعد وہ دیوارِ گریہ کے سایہ میں روتی ہوئی پائی گئی۔ وہاں اس نے خدائے توریت و زبور سے ایک میثاق کیا۔ اگر اس کے ہاں کوئی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ اس کو راہ رشد و ہدایت پر ڈالے گی۔ چند ایّام کے بعد اس نے ہرمقس نامی ایک سوداگر سے شادی کر لی وہ ہیروں کا تاجر تھا۔ اور اس کے جہاز سُرخ پانیوں میں تیرتے تھے۔ جب لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے ایک جشن منایا اور لڑکی کی تربیت و تعلیم کے لئے بیت المقدس کے سربرآوردہ عالم مقرر کئے۔ اسے چودہ علوم کے اسرار پڑھائے گئے۔ اور جب وہ فارغ التحصیل ہوئی تو کنعان

کے چار دانگ میں اس کا نام گونج رہا تھا۔

"کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ فضیلت اب بنی اسرائیل سے رخصت ہونے والی ہے۔"

بوڑھے نے پھر ستاروں کی طرف دیکھا۔

"ایسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔"

اگر وہ نور بیت المقدس سے نکلنے ہی دیا جائے تو پھر؟

نجم نے اپنی بیضوی آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے ہونٹ دانتوں میں دبائے دور دیکھ رہی تھی۔ جہاں مسجد اقصےٰ کا سیاہ کلس اوندھے پیالے کی طرح نظر آرہا تھا۔

"جس کی پشت سے وہ مشعل نکلنے والی ہے۔ اگر تم اس کی نشانیاں مجھ کو بتا دو تو تم دیکھ لو گے کہ بیت المقدس کے تقدس کے سامنے میں کس طرح ایک سدِ آہنی بن کر کھڑی ہو جاؤں گی۔"

اس کے گلے کا نیلم آسمانی ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ نجم نے اس کے الفاظ کے اندر اس کی ماں کا جنون دیکھ لیا۔ اس کے الفاظ آہنی عزم اور آتشیں جوش میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"تمہیں وہ شخص فاران کی چوٹیوں کے نیچے ملے گا۔ اس کی پیشانی لافانی تابانی سے منور ہو گی۔"

اس کے بعد دونوں چپ چاپ آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے بیت المقدس کے گرم آسمان پر سلیمان کے نابود ہیکل کے ڈھیر کے اوپر تارے بدستور چمک رہے تھے۔ احمد دل ہی دل میں کہہ رہی تھی: "ایک ستارہ میں ہی ہوں میں اس شمع کو ضرور واپس لاؤں گی"۔

دوسرے دن وہ دیوار گریہ کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ دیوار کے پرلی طرف توریت کی یزداتی تختیاں زیر زمین دفن تھیں۔ لیکن کون جان سکتا تھا کہ وہ کس سِل کے نیچے تھیں؟ اس لیے کوئی انسانی قدم ان پتھروں پر چلنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ مبادا خاکی انسان کے پاؤں آسمانی الفاظ پر پڑ جائیں اور ساتوں آسمان ریت کے گھروندے کی طرح کھڑکھڑاتے ٹوٹ گریں۔ سسکیوں اور ہچکیوں کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آوازیں گھٹے ہوئے حلقوں سے پیدا ہو رہی تھیں۔ اسرائیل کی بدقسمت اولاد اب بھی اسی جگہ کھڑی تھی جہاں موسیٰ وہارون نے اُسے چھوڑا تھا۔ وہ حیران و سرگشتہ تھی جب سے ارضِ موعود اس کے قدموں کے نیچے سے کھسک گئی تھی۔ وہ خدا کی برگزیدہ قوم تھی وہ خدا کے لاڈلے بچے تھے۔ لیکن ان کا خدا کہاں تھا۔ گیا وہ اس سے دور تھے، یا وہ ان سے دور؟ شاید وہ درمیانی خلا کو آنسوؤں اور سسکیوں سے عبور کرنا چاہتے تھے۔ تاہم وہ سب جہان سے اولیٰ و افضل تھے۔ وہی تھے جن پر بخت نصر کی فوج کرگسوں کی طرح جھپٹی لیکن وہ نہ رہا وہ رہ گئے۔ وہی تھے جن پر طیطس کا غضب ٹوٹا اور سلیمان کا ہیکل درخت کے کھوکھلے تنے کی طرح چرمراتا نیچے آ رہا۔ پر وہ نہ رہا وہ رہ

گئے — بنی اسرائیل، آلِ اسحاق۔ اخوبہ نے اپنے پیش و گمرہ نگاہ دوڑائی۔ بہ دقتی ہوئی آنکھوں نے اس کے سامنے تصور لا کھڑا کر دیا جب اہرامِ مصر کی تپتی ہوئی چوٹیوں تک وہ پتھروں کی بڑی بڑی سلیں اپنی کمر کی پشتوں پر پہنچا رہے تھے۔ ان کی پیٹھوں پہ کوڑے جنگی نقاروں کی طرح بجتے لیکن انہوں نے سب کچھ سہا۔ انہوں نے اپنے مردوں کو کٹوایا اور اپنی عورتوں کو فراعنہ مصر کی ہوس رانی کی بھینٹ چڑھتے دیکھا۔ پھر وہی تھے جو اُٹھے اور فرعون کے تخت پر چڑھ دوڑے۔ وہی تھے جنہوں نے بحیرہ احمر کے پانیوں کی موٹی چادروں کے درمیان اپنا راستہ نکالا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ مشعل جو وہ پورے ہزار برس سے تھامے چلے آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جائے جن کی گردنیں ان کے سود کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہوں۔ وہ نور جو سینا کی جھاڑی سے نکلا اور ناصرہ کے اصطبل میں چمکا وہ صرف پاک گھر ہی کو روشن کرنے کیلئے ہے۔

"میں اس نور کو بچاؤں گی، اسحٰقؑ یعقوبؑ کے خداوند مجھ کو توفیق دے۔"

"آمین" عبادت گذاروں کی ہم آہنگ پکار گونجی۔

اخوبہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ دعا شروع ہو چکی تھی۔

اخوبہ نے اپنی محبوبہ حبشن بوڑھیا کو سنا دیا کہ وہ عزمِ سفر کر رہی ہے سفر بھی چھوٹا نہیں پوری زندگی کا سفر، یہ بساطِ سفر کھلی ہی دل کی قیمتی آرزوؤں اور عزائم پر تھی۔

"سچ کہتی ہو بنت بریرہ ؟" جبشن کا منہ یہ خبر سنتے ہی نیم وا ہو گیا۔ اس کے سفید دانت سیاہ ہونٹوں کے درمیان شب دیجور میں بجلی کی طرح چمکے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ عبرانی پھول جس کی سینچ ساسانی اور رومی خون سے ہوئی ہو، جو مشرق کی رات کا نجم سحر ہو، وہ صحرائی جھونکوں میں یوں لڑکھڑاتا پھرے گویا گھاس کا حقیر تنکا ہے۔

بنت بریرہ، چھی چھی، میں سمجھتی ہوں کہ تم میں اپنی ماں کا جذبہ شوق و عزم والہانہ اُبل رہا ہے۔ تاہم ضبط ضبط۔"

احوبہ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اگرچہ اس کے دل میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

"ہاروت و ماروت کی زائیدہ، تجھے چلنا ہو گا میرے ساتھ۔ تجھے موت کے گھاٹ اُترنا ہو گا میرے ساتھ۔ مجھ کو وہ شمع لینے جانا ہے۔ جو آل یعقوب کی میراث ہے۔ صرف تم اور قیس ساربان — لیکن سنو، یہ کسی پر فاش نہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر احوبہ اپنی شب گاہ کی طرف چل دی۔ سمیّہ کا منہ بدستور کھلا ہوا تھا۔ یہ فیصلہ سُن کر اور بھی کھل گیا۔ "آہ ہرمقس کی بیٹی، بنت بریرہ۔"

کچھ دنوں کے بعد وہ انجیر و زیتون کی سرزمین سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور ان کی اونٹنی نے صحرائے عرب میں اپنا قدم رکھ دیا۔ مصائب و نوائب کے طویل لمحات اپنی گھناؤنی روح سمیت پرے باندھے چلے آ رہے تھے۔ گرمی اپنا راستہ بنائے چلی آ رہی تھی۔ اور سورج عین خطِ استوا پر آن کھڑا ہوا۔ صبح کے وقت سورج ریت کی دبیز چادر

سے اپنا منہ نکالتا اور اس کا طلائی چہرہ تمتما اٹھتا۔ طوفانوں اور آندھیوں کی گھڑیاں شروع ہو جاتیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ریت کے چمکیلے ذرات پتنگوں کی مانند اڑتے اڑتے ایک بگولے کی صورت بن جاتے جو تمام کرۂ فضا پر محیط ہو جاتا۔ شام کے وقت ریت کا پرسکون سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا جس کے سناٹے کو توڑنے والا یا تو قیس کا پُر درد گیت ہوتا یا حبشن کی امید و بیم سے چھلکتی ہوئی دعائیں۔ کہیں کہیں نخلستان کے جزیرے اپنے پھیلے ہوئے سایوں سے صحرا نوردوں کو اپنی طرف مدعو کر لیتے۔ ان کی ٹھنڈی ندیاں اپنی سرد موجوں کو کھجور اور زیتون کی چھاؤں میں سبک رو ہوا کے بربط پر اچھالتیں لیکن پھر دہی تشنگی کام و دہن ہوتی، اور وہی سراب جس کا سحر انگیز فریب انسان کو آرزو کی مانند منزل منزل دھکیلتا لئے چلا جاتا ہے۔

تبوک کے قریب گھنے باغات کا جلوہ نظر آیا۔ احوبا اپنے محمل سے نکلی۔ اس کا چہرہ خزاں زدہ گل کی طرح فسردہ ہو رہا تھا۔ گرمی کا پیلا رنگ اس کے چہرے پہ دوپہر کے خشک بادل کی طرح چھایا ہوا تھا۔ ندی کے ٹھنڈے پانی سے اس نے اپنا منہ دھویا۔ اور اسی کے آئینے میں اپنے بال سنوارے جبکہ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی اور بوڑھی حبشن پانی میں کلیلیں کر رہی تھی تو اس نے اپنے پیچھے پاؤں کی چاپ سنی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے سامنے ایک بوڑھا مسیحی درویش کھڑا تھا۔ اس کی نقرئی داڑھی ہوا میں لہرا رہی تھی۔ اور اس کی سبز عبا پر صندلی صلیب ابدی رحمت کی طرح آویزاں تھی۔

"محترمہ، اگر تم کھجوریں اور بکری کا دودھ چاہو تو اس درویش کی کٹیا حاضر ہے۔"
اس نے انگلی سے کھجوروں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ جس کے پیچھے ایک چھوٹی سی کٹیا تھی۔ احوبہ اس کی پیش کش رد نہ کر سکی۔ اس لئے وہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی ”یہاں بیٹھو۔“ اس نے پھوس کے ایک تخت کی طرف اشارہ کیا۔

درویش تھوڑی دیر کے بعد بکری کا تازہ دودھ اور کھجوریں لے آیا۔ اس نے طشت احوبہ کے سامنے رکھ دیا۔ ”محترمہ میری دنیا تمہارے لئے یہی کچھ پیش کر سکتی ہے۔“

ندی سے ہائے ہائے کی دردناک آواز آئی۔ درویش اپنے بڑھاپے کے باوجود سبک رفتاری سے ندی کی طرف بڑھا۔ ایک عورت کے پاؤں میں ایک بڑا سا کانٹا لگ گیا تھا۔ اس کا مٹکا اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اور اس کے پاؤں سے خون کی ایک پتلی سی لکیر جاری تھی۔ درویش نے اس کے زخم پر اپنا لعاب لگا دیا۔ اور اس کا خون ایکا ایکی بند ہو گیا۔ پھر اس نے خود مٹکا بھرا اور اپنے سر پر اٹھا اس کے آگے آگے ہو لیا۔

جب وہ لوٹا تو احوبہ اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی۔

”تیرے مقدس چہرے پر نور برس رہا ہے۔ اے محترم بزرگ میری رہنمائی کر!“

درویش کی پرسکون و ملائم آنکھیں کھجور کی جھالر دار شاخوں کو دیکھ رہی تھیں جو ہوا میں جھوم رہی تھیں۔

"خاتون، تم ذرّے کو آفتاب سمجھ رہی ہو۔ تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ میں اپنے ازلی گناہوں کا بار کش ہوں اور خدا کی آسمانی سلطنت کی دید کا خواہاں ہوں۔"

"نہیں نہیں، مقدس باپ، مجھ کو دھوکا نہیں ہوا۔ میں آرزو زدہ ہوں۔ فریب زدہ نہیں۔ صرف موت میری راہ میں حائل ہے۔ ورنہ میں ریت کی مانند ہمیشہ ہمیشہ پیاسی رہنے والی ہوں۔"

"سچ ہے، سچ ہے۔" بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "چہرہ دل کا آئینہ ہے۔"

"کیا تم مجھ کو بتا سکتے ہو کہ وہ مشعل اب کدھر جائے گی جس کو یعقوبؑ نے روشن کیا تھا۔"

احوبہ اضطراب اور بے چینی سے بوڑھے راہب کے خشک اور پیلے ہونٹوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بوڑھے کے چہرے کے نقوش یکایک کھنچ گئے۔ اس کی پیشانی اس طرح شکن آلود ہو گئی۔ گویا اس کے دل میں سخت درد اٹھ رہا تھا۔ اور وہ اسے دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"باعزم خاتون جس درخت کی جڑ کو اس کی شاخیں ہی کھا گئی ہوں۔ اس درخت سے باروری کی اُمید پتھر سے موم کی توقع ہے۔" پھر اُس نے آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم اس شمع کو واپس لانے جا رہی ہو۔"

"ہاں مقدس راہب، مجھ کو تمہاری مدد اور تائید چاہیئے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بوڑھا بڑبڑایا۔ پھر وہ طویل مراقبے میں ڈوب گیا جب اس

نے سر اٹھایا تو اس کی پیشانی پر پسینے کے باریک قطرے کھڑے تھے۔

"میں تمہاری امداد پر قادر نہیں۔ لیکن ایک بار تمہارے پاس آؤں گا ضرور۔"

۳

ان دنوں وادیٔ لطجا میں یہ خبر آگ کی طرح دوڑ گئی کہ فاران کے سایہ تلے ایک ایسی عورت خیمہ زن ہے جو بیت المقدس سے آئی ہے اور اپنے سیم و زر کو خاک کی طرح اڑا رہی ہے۔ "یہ عورت کون ہو سکتی ہے؟" لوگ سوچ رہے تھے۔ "یہ ضرور کوئی ملک بدر شہزادی ہے یا شاہ حیرہ کی جاسوس!" لوگوں نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دے دیا۔ اعرابی اور بدو اپنے ٹٹوؤں پر سوار ہو کر اس کے خیمے کے سامنے سے گذرتے۔ لیکن اس عورت کی نگاہ میں ان کی بھی اتنی ہی حیثیت تھی۔ جتنی کہ اس شہسوار کی کہ جس کے سر پر سیاہ عمامہ بندھا ہو۔ جس کے گھوڑے کی ٹاپوں سے پہاڑیاں گونج اٹھتی ہوں۔ اور جس کے بھالے کی انی ان گنت سینوں کا خالص خون چوس آئی ہو۔ ہر راہ گیر اس کے مال و دولت میں برابر کا شریک تھا۔ اگر وہ یوں لینے سے انکار کرتا تو وہ ہدیہ قبول کرنے پر اصرار کرتی۔ لیکن ایک دن ایک ایسا عرب بھی آپہنچا جس نے اصرار کے باوجود ہدیہ بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اور اس کی سنہری تلوار اس کی کمر میں لٹک رہی تھی۔ وہ معمر تھا۔ لیکن اس کے خال و خط، چہرے کی درخشاں رنگت، پر جلال نگاہیں، اور با متانت بولی اس کی سرداری کی چغلی کھا رہی تھیں۔ احوبہ نے سونے کا طشت چاندی سے بھر سمیہ کو دیا

اور کہلا بھیجا کہ ایک بار، صرف ایک بار، وہ شیخ اس کے سامنے سے گذرے۔
جب سمیّہ سونے کی طشتری لے کر اس کے سامنے گئی تو اس نے آنکھ اٹھا کر سمیّہ کی طرف دیکھا۔ سمیّہ کا ہاتھ لرز گیا اور طشتری چھن سے روپہلی اور سیمیں ٹکیوں سمیت زمین پر آرہی۔

"تم نے مجھے کیسا جانا تھا۔ جاؤ اپنی مالکہ سے جا کر کہہ دو کہ اس نے آج تک کسی عربی گھوڑے کی ہنہناہٹ نہیں سُنی ہے"

شیخ کی آنکھیں آفتاب کی حدت سے چمک اٹھیں۔ اس کے ہاتھ گھوڑے کی عنان پر زیادہ مضبوط ہو گئے۔ جب سمیّہ نے احوبہ کو شیخ عرب کا پیغام دیا تو اس نے خیمے کی جالی میں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بلاشبہ سردار قوم تھا۔

احوبہ نے پیغام بھیجا: "اے محترم شیخ، یہ درخواست دل خراشی کے لئے نہ تھی بلکہ ایک اجنبی کا دست صلح و امن تھا۔ کیا وہ عورت کی قدر نہیں کرتے؟"

شیخ نے جواب دیا: "بے شک، ہم مسافر اور عورت کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے ہم چراگاہ کے درخت پر انڈے دینے والی کبوتری کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ بہادر اور دلیر ہے تو وہ ہمارے دل میں اپنے لئے اسی صف میں جگہ پائے گی جس صف میں ہمارے برق رفتار گھوڑے کھڑے ہیں۔"

یہ سُن کر احوبہ باہر نکل آئی۔ اس کے چہرے پر سیاہ نقاب چاند پر بادل کے کسی لطیف ٹکڑے کی طرح لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی عبرانی آنکھیں نقاب کی جالی میں سے

شیخ کو گھور رہی تھیں۔ اس کے مرمریں گلے میں سُرخ موتیوں کی مالا جگمگا رہی تھی۔ اُور اس کا لباس سونے کی تاروں سے گندھا ہوُا تھا۔ شیخ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر دور اُفق کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں بیت ابراہیم اور اس کے ساکنان کی خدمت میں اپنی نذر لئے پیش ہوئی ہوں۔ کیا محترم شیخ میرا یہ حقیر تحفہ قبول فرمائے گا۔"

"میں تمہیں نگاہ حیرت سے دیکھتا ہوں خاتون، اگر تمہیں ایسا ہی کرنا ہے تو تم اسے کعبہ کی نذر کر سکتی ہو، تم مجھ کو وہیں پاؤ گی، میں ہاشم کا بیٹا ہوں"

اس شخص کے سوا ہر راہ گیر وہاں سے جھولی بھرے گزرتا۔ وہ اس کے جالی دار خیمے کے سامنے سے گزرتے اور نذرانہ لیتے وقت اپنے چہرے پر اس پردہ دو سیاہ زیتونی آنکھیں اپنے چہرے پر گڑی پاتے۔

ان دنوں مکہ میں جوئے اور شراب کی خوب گرم بازاری ہو گئی۔ عرب شہسوار سونے کی ٹکلیوں پر شرطیں بدتے۔ ہر صبح و شام میدان عرفات میں اونٹوں اور گھوڑوں کی دوڑیں ہو رہی تھیں۔ نیزے چل رہے تھے۔ اور قتل کی وارداتیں پہلے سے کچھ بڑھ گئی تھیں۔ کچھ بھی ہو عربی خون تمازت آفتاب اور طعن آمیز چرکے پر کھول اُٹھتا ہے عورت، شراب اور دولت محض تفریحات تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد حرم کعبہ میں شاعروں کا جمگھٹا لگا ہوُا تھا مضبوط پٹھوں والے

گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے وادیٔ لطحا گونج اُٹھی۔ عربی گھوڑوں کی ایالیں پُرگوشت گردنوں پر شاہی خلعت کی طرح جھول رہی تھیں۔ اور دراز قد اونٹ اور اونٹنیاں اپنی لمبی لمبی گردنیں جھکا جھکا کر حرمِ کعبہ کے اندر دیکھ رہی تھیں۔ جس کے صحن میں ہوا سے پھولی ہوئی فرغلیں کعبہ کے گرداگرد طواف کر رہی تھیں۔ اور میدانِ جنگ میں موت سے کھیلنے والے شاعر اپنے پُرافتخار اشعار قرطاس یاد سے پڑھ رہے تھے۔

اے لیلیٰ اگر تو اپنے جام کو گردش دینا چاہتی ہے۔

تو اسے دائیں ہاتھ سے شروع کر، ہم بھی تشنہ لب منتظر ہیں۔

اور جب ہم جنگ کی چکی کسی قوم کی طرف لے جاتے ہیں۔

تو وہ اس میں اِس طرح پس جاتی ہے جیسے آٹا۔

ہم میں سے کوئی سردار اس وقت تک نہیں مرتا۔

جب تک کہ اس کی جگہ لینے کو ایک اور تیار نہ ہو جائے۔

جنگ کے زمانے میں ہمارا خون پانی کی طرح سستا ہوتا ہے

لیکن عہدِ امن میں وہی خون کسی قیمت پر بھی مل نہیں سکتا۔

(عمرو بن کلثوم)

وہ خالص عربی فطرت کو بے نقاب کر رہے تھے۔ ان عربوں کی فطرت، جن کا خون ریت کے ذروں کی طرح چمکیلا اور سورج کی طرح گرم تھا۔ ان کے اشعار میں آگ تھی۔ اور شعراء کی آنکھیں انتہائی خودداری اور مردانہ انانیت سے دہک رہی

تھیں۔ کعبہ کے گرد و اگرد ملمع پانی سے اشعار مرقوم تھے۔

احوبہ یہ سب کچھ دیکھتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ہر راہرو، ہر گھوڑ سوار اور سانڈنی سوار کو تک رہی تھیں۔ حتیٰ کہ بعض نوجوانوں کو کچھ وہم سا ہونے لگا لیکن وہ ایک نظر ہر ایک کو دیکھتی ہوئی آگے نکل گئی۔ گویا وہ تلاشِ گمشدہ میں محو تھی۔ لیکن وہ کہاں تھا؟ وہ اپنے دل سے بار بار یہی سوال پوچھ رہی تھی۔ "وہ کہاں ہے؟"

ان کی گھما گہمی ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔ اور شعرا اپنے خیموں کے اندر شراب کے مٹکوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ منتخب اشعار کی مذہب تختیاں کعبہ کی دیواروں پر لٹکی ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی تھیں۔ اور ہجوم اپنے بازگشت کی تیاری کر رہا تھا۔ دل برداشتہ احوبہ نے بھی اپنے ساربان کو واپسی کا حکم دیا۔

جونہی وہ لوٹ رہی تھی کہ اس نے کعبہ کی بستی سے باہر ببول کے درخت کے نیچے ایک جواں سال لڑکی کو دیکھا۔ جو درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ صحرائی آفتاب کی آخری کرنیں اس کے چہرے کو اپنی طلائی تابش سے ملمع کر رہی تھیں۔ وہ ایک سیاہ لبادے میں ملبوس تھی۔ اس کی غزالی آنکھیں پانی کے اس شفاف چشمے کی طرح چمک رہی تھیں جس کی تہ تک کے سنگریزے روشنی میں نظر آجاتے ہیں۔ یا گویا اس کی آنکھیں آسمانی نغموں کی شبنم سے پُرنم تھیں۔ وہ مریم امِ عیسیٰ کی طرح خاموش کھڑی تھی۔

"اونٹنی بٹھا دو۔" احوبہ چلائی۔

جب اونٹنی بیٹھ گئی تو وہ ایک بے اختیار جذبے کے ماتحت پردے سے نکل آئی۔ اور اس کے قریب جا کھڑی ہوئی "تم آلِ بنی اسرائیل ہو؟"

"نہیں" اس نے معصومانہ انداز میں ملائم و شیریں آواز میں جواب دیا "میں خاندانِ پاسبانِ حرم سے ہوں"

"تمہارا نام؟"

"آمنہ"

احوبہ کے نہاں خانۂ دل میں یہ نام دوبارہ گونجا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا یہ نام اس کے لئے معانی کی ایک آباد دنیا اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس نے سمیّہ کو آواز دی اور وہ سونے کی طشتری لئے آگئی۔ کسی عورت کی خدمت میں اس کا سب سے پہلا ہدیۂ نیاز تھا۔

"میرے لئے اونٹنی کا دودھ کافی ہے" یہ کہتے ہوئے وہ مڑی اور چلی گئی۔

خیمہ میں آتے ہی اس نے اپنا صندلی آئینہ نکالا اور اپنی صورت دیکھی۔ اس نے اپنے چہرے کو ہر طرف سے گھما کر دیکھا۔ لیکن لیکن —— اس میں فطرت کی سادہ گلکاری پر انسانی صنعت کے نقوش بھی تھے۔ فطرت کے نرم و ملائم بھولے پن پر انسانی عزم و ارادہ کی صلابت بھی موجود تھی۔ اپنے دل کے اندر اس نے کچھ محسوس کیا۔ ایسا کچھ جو اس کی زبان تک نہ آسکتا تھا۔ آسمان پر سورج کی آخری سُرخی بھی غائب ہوگئی تھی۔ اور ردو قسمت بھرے ستارے آسمان کی سدا بیدار آنکھوں کی طرح روشن تھے۔ وہ اب کافی

قریب آچکے تھے۔ احوبہ کا دل بے اختیار دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اس نے سیاہ افق کی طرف دیکھا اور حسرت آگیں آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ دن چڑھتا اور رات کے اندھیرے میں گم ہو جاتا۔ رات پھیلتی اور دن کے اجالے میں سمٹ جاتی۔ لیکن احوبہ کا نجم آرزو ابھی تک دکھائی نہ دے رہا تھا۔ نکہ اور منیٰ کے درمیان سیکڑوں انسان بستے تھے۔ ہزاروں گذرتے تھے۔ لیکن ان سب کی پیشانیاں اس نور سے خالی تھیں جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھی۔

ایک صبح اس کے خیمے کے سامنے ایک یک چشم راہب کھڑا تھا۔ جو احوبہ سے ملاقات کا متمنی تھا۔ جب سمیہ نے اس کی اطلاع کی تو احوبہ اس وقت دعا مانگ رہی تھی

"وہ کون ہے؟" احوبہ نے سمیہ کی طرف رخ کئے بغیر پوچھا۔

"وہ کہتا ہے میں یہوو ی ہوں۔"

"تو پھر اسے اندر بلا لاؤ۔"

دوسرے لمحے وہ راہب احوبہ کے عین سر پر کھڑا تھا۔ اس کی ایک آنکھ خراب کوئیں کی طرح بند تھی۔ اور دوسری قطب ستارے کی طرح روشن۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"میں نے سنا ہے تم آل یعقوب کا سرمایۂ حیات لوٹانے آئی ہو؟"

احوبہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ کیسے جان گیا؟ اس نے سرنگاہوں سے راہب کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ باچھ۔ل سے پھیلتی ہوئی اندھی آنکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اوراس کی روشن آنکھ اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے باز قابو میں آئے ہوئے شکار کو۔

"مَیں معلوم کرسکتا ہوں۔ مجھ کو آسمانی علم سے نوازا گیا ہے۔ مَیں ہر چیز کو جان سکتا ہوں۔ انسان کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل کی کیفیت بھانپ سکتا ہوں۔ لوگوں کی زبانوں سے بات سُن کر ایک شخص کی صحیح صحیح تصویر اپنی نگاہوں میں اتار لیتا ہوں اور کسی کے بچپن سے اس کی نیت بھی تاڑ لیتا ہوں۔" احوبہ اس کی طرف خاموشی سے تک رہی تھی۔ وہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "مَیں تمہیں ایک نوید سنانے آیا ہوں۔"

احوبہ کا بجھتا ہؤا چہرہ روشن ہو گیا۔

"تم یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہوگی۔"

"خدا تیرا منہ آسمانی شہد سے میٹھا کرے۔" احوبہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"تمہارا نام ہر اس زائچے پر لکھا ہوتا ہے جو بنی اسرائیل کی قسمت پر ڈالا جاتا ہے۔"

احوبہ کا دل مسرّت سے جھُومنے لگا۔ اُس نے سمیہ کو پکار کر سونے سے بھری تھیلی لانے کا حکم دیا۔

"لیکن میں تو ابھی تک اپنا گوہرِ مقصود پانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔"

"اسی لیے تو میں آیا ہوں۔"

"کیا؟" احوبہ چلائی۔

"ہاں ہاں میں اسے تمہارے پاس لا سکتا ہوں۔"

"سمیہ سونے کا ایک توڑا لاؤ۔"

یک چشم راہب زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنی داڑھی پر تیزی سے ہاتھ پھیر رہا تھا اور احوبہ خوشی میں ڈوبی جا رہی تھی۔

جب راہب چلنے لگا تو اس نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ "یہ راز کسی پر فاش نہ ہو۔ تم جانتے ہو انسانی دنیا کا پانسہ اُلٹنے والا ہے۔"

"تم مجھے نادان سمجھتی ہو۔ ہرمنقس کی بیٹی۔"

احوبہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں" اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں ہر ایک شخص کا نام بھی معلوم کر سکتا ہوں۔ میں اسے کل تمہارے پاس لاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پشت پہ سونے کے توڑے رکھ لیے۔ چلتے ہوئے اس نے کہا۔ "صرف تمہاری دل شکنی کا خیال دامنگیر ہے۔ ورنہ میں تمہاری یہ دولت کبھی بھی قبول نہ کرتا۔ راہب کا دھن سے کیا کام۔"

دوسرے دن اس کے خیمے کے باہر ایک سفید خچر اچھل کود رہا تھا۔

۴

اسی شام مکہ کی گلیوں میں مشہور ہو گیا کہ فاران کی چوٹیوں کے نیچے جو عورت خیمہ زن تھی وہ ایک ساحرہ ہے جو اپنے جو تر سے مکہ پر تسلط جمانا چاہتی ہے۔ کسی نے کہا، "ممکن ہے وہ شاہ حیرہ کی جاسوس ہو۔"

دوسری صبح اس کے خیمے کے باہر چار گھوڑ سوار کھڑے تھے۔ انہوں نے نمیہ سے کہا، "ہم تمہاری مالکہ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

احوبہ نے جواب بھیجا وہ اندر آسکتے ہیں۔

"نہیں"۔ ان کے سردار نے ترش لہجے میں کہا۔ "اسے باہر آنا ہوگا۔"

احوبہ باہر نکل آئی۔ وہی شیخ اس کے سامنے کھڑا تھا جس نے اس دن کی خیرات لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش اجنبیت سے سخت ہو گئے تھے۔

"ہماری مہمان، محترمہ، ہم کافی مل چکے ہیں۔ ہم اس زر و دولت کے بھی ممنون ہیں جس کی چمک سے ہماری صحرائی گلیاں جگمگا اٹھی ہیں۔ لیکن مختصر قیام محبت کی شدت کو بڑھاتا ہے۔ جبکہ طویل قیام نفرت کی آمیزش کے بغیر ہو نہیں سکتا۔"

احوبہ چپ کھڑی تھی۔

"ہم اپنی دوستی کا حق ادا کئے دیتے ہیں۔ بعد کے فسادات کے ہم یقیناً ذمہ دار نہیں ہوں گے۔"

"میں آپ کی شکر گزار ہوں"۔ احوبہ نے کہا۔ "میں بھی معزز خاندان سے تعلق رکھتی

ہوں اور مجھ کو فخر ہے کہ میں سردار مکّہ سے ہم کلام ہوں۔ کیا مجھ کو اس وقت تک قیام کی اجازت ہے۔ جب تک کہ ہلالِ نو بدر بن کر غائب نہ ہو جائے۔"

کچھ توقف کے بعد سردار بولا "لیکن معزز خاتون کو بستی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے باگیں موڑیں اور غبار کے بادلوں میں گم ہو گئے۔

اس شام احوبہ نے ستاروں کو دیکھا وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ "کیا واقعی ان میں سے ایک میں ہوں؟" اس نے اپنے آپ سے پھر سوال کیا۔ آہ آرزوئیں عزم کا دامن پکڑے آتی ہیں۔ لیکن وہ جانتی نہیں کہ اُمید کے خوشے کے ساتھ حسرت کا خار بھی لگا ہوتا ہے۔

احوبہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ستارے ایک دوسرے کے بہت ہی قریب آ گئے تھے۔ جب اس کے خیمے کے قریب ایک قافلے نے آن پڑاؤ لگایا۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح احوبہ وقت کی بساط پر اپنا آخری پانسہ تک لگا دینا چاہتی تھی۔ وہ ہر راہ رو کا چہرہ دیکھنے کے لئے دولت کی تھیلیاں دینے کو تیار تھی۔ اس نے سمیہ کو یہ معلوم کرنے بھیجا کہ وہ قافلہ کہاں سے آ رہا تھا۔

"وہ شام سے آرہا ہے اور مکّہ جارہا ہے۔ وہ مکّہ ہی کے تاجر ہیں۔ سمیّہ نے خبر سنائی۔

امید کی ٹمٹماتی شعاع چمک اٹھی۔

"جن کی بیٹی بھاگ، اور اُن سے کہہ کہ اگر وہ سونا چاندی لینا چاہتے ہیں تو میرے خیمے کے سامنے سے ایک ایک کر کے گذریں۔"

جب عربی بدوؤں نے یہ خبر سُنی تو اُنھوں نے گرد سے اَٹی ہوئی ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیرا۔" کیا وہ ملک غسّان کی بیٹی ہے؟"

"نہیں ایک عبرانی شہزادی ہے جو اپنے گناہوں کا کفارہ بیتِ ابراہیم کے جوار میں ادا کرنا چاہتی ہے۔"

اُنھوں نے اپنے جوتوں کی خاک جھاڑی اور ایک ایک کر کے اس کے خیمے کے سامنے سے گذرتے گئے اور تھیلیاں لیتے گئے۔ سب نے اپنے چہروں پر پس پردہ دو سیاہ آنکھوں کی ٹکٹکی چبھتی محسوس کی۔

"کوئی باقی تو نہیں۔"

"صرف ایک ہے اور وہ ایسی خیرات لینے سے انکاری ہے۔"

"وہ ضرور کوئی پاسبانِ حرم کعبہ ہی ہو گا۔" احوبہ بے ساختہ پکار اُٹھی پھر معاً اُس نے محسوس کیا گویا وہ اسی کے متعلق کہہ رہی تھی۔ جسے وہ ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

"جا سمیّہ اس سے کہہ کہ وہ راہ خدا میں بھی کچھ لینے کو تیار نہیں؟"

کچھ وقفہ کے بعد سمیّہ جواب لائی "میں راہِ خدا میں دینے کا عادی ہوں لینے کا نہیں۔"

یہ قریشی پندار کا خاصہ تھا۔ جب احوبہ نے جواب سُنا تو اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے محسوس کرلیا وہ چشمہ کے کنارے پر پہنچ گئی تھی، بالکل وجدانی طور پر۔ اور پھر بھی اپنے اس یقینِ وہبی کو سہارا دینے کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل نہ تھی۔

"اس سے کہہ اگر وہ نہیں آسکتا۔ تو ایک ملتجی کو شرفِ ملاقات بخش سکتا ہے؟"

جواب ملا "بے شک۔"

قافلے کے اونٹ قطار در قطار بیٹھے ہوئے تھے۔ ان پر کجاوے بدستور کسے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کا قیام بالکل لمحاتی تھا۔ ایک درخت کے نیچے چند جوان تیراندازی کر رہے تھے۔

"میں اپنے سونے کی تھیلی پر شرط لگاتا ہوں۔ تم اپنے تیر سے چوٹی کی شاخ کو نہیں کاٹ سکتے۔"

دوسرے نوجوان نے عقابی نگاہوں سے شاخ بلند کی طرف دیکھا۔ جو ہوا کے اشاروں پر جھوم رہی تھی۔

"لات وعزّیٰ کی قسم۔ میں ایسا کرسکوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے نشست باندھ کر تیر چھوڑا۔ شاخ چھٹی اور چرمراتی ہوئی نیچے آرہی۔

"وہ مارا" نوجوان خوشی سے چلّایا "ابراہیم و اسماعیل کی قسم میں آدھی دولت

ان کی بھینٹ چڑھاؤں گا۔ وہ تیر اندازی کے فاطر تھے۔"

احوبہ ان کے قریب سے گذری اور اس کجاوے کے قریب آن کھڑی ہوئی جس میں وہ معزور۔ قریشی نیم دراز تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بھی لیٹا رہا۔ جب وہ اس کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی تو اُس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں نجابت اور خود اعتمادی کی مستی تیر رہی تھی۔ اس کے سیاہ گیسو اس کی درخشاں پیشانی پر لوٹ رہے تھے۔ اور اس کا سُرخ و سپید چہرہ آسمانی نور سے دُھلا ہُوا تھا۔ "یہ تو وہی ہے۔ یہ تو وہی ہے۔" احوبہ کا دل زور سے اُچھلا۔ اگر وہ اپنے شعور کی مجموعی قوت سے ارادہ کو عناں میں نہ رکھتی تو یقیناً وہ جھک کر اس سے لپٹ جاتی۔ اور اس کے فراخ سینے پر اپنا سر رکھ کر ڈھائیں مار مار کر روتی لیکن نسائی حیا سب سے زیادہ قوی تھی۔

"اے جوہر عرب معزز سردار، میں ایک فریضہ ادا کر رہی ہوں۔"

معزز سردار نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ احوبہ خوشی سے کانپ رہی تھی۔

"میں خود خیرات دیتا ہوں۔" اس نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ اس کی آواز سے اس کی مردانگی نمایاں ہو رہی تھی۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی پیشانی کا نور بدر منیر کی مانند جگمگا اُٹھا۔

"مَیں خیرات لے سکتی ہوں؟" احوبہ نے وفورِ سرور کو دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔"

احوبہ ایک قدم اور قریب آ گئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ اونٹ لاپروائی سے جگالی کر رہے تھے۔ اور درخت کے نیچے وہ لوگ نئی شرط پر شور مچا رہے تھے۔

وہ اس کا ہاتھ چوم لینا چاہتی تھی۔ اب کسی رسم و تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ دنیاوی آئین کی اب کیا احتیاج تھی؟ جب کہ اس کے سامنے وہ موقع تھا جس میں اس کی پوری زیست کا مقطر نچڑ کر آ گیا تھا۔

"مجھے اپنی باندی بنا لو۔ میں سرزمین کنعان کے ایک باوقار خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔"

" اس نے اسی لاپروائی سے اُس کی طرف دیکھا۔

"نقاب اُٹھاؤ۔" اُس نے حکم دیا۔

اس نے اپنے چہرے سے سیاہ نقاب اُلٹ دی۔ اُس کی پلکوں پر آنسو آخرِ شب کے ستاروں کی مانند جھلملا رہے تھے۔ سردار قریش اپنی سیاہ اور مست آنکھوں سے اُس کے حُسن کا تجزیہ کر رہا تھا۔

"مجھ کو کنعان کا یہ پھول قبول ہے۔" اُس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

اس کا گلا فرطِ مسرت سے گھٹنے لگا۔ "میں کل تمہارا انتظار اپنے خیمے پر کروں گی۔"

"کل؟"

"ہاں کل، تمہیں تین سو ساٹھ عربوں کی قسم، تم کل ضرور آؤ۔ کیا میں عقد و عدہ میں

تمہارا خنجر لے سکتی ہوں؟"

وہ مسکرایا اور اس کے موتیوں سے سفید دانت چمکے۔

"یہ لو، تم نے عربی زبان کی تیزی نہیں دیکھی۔ یہ خنجر سے زیادہ تیز ہے۔" اس نے اپنے سرہانے کے نیچے سے سنہری خنجر نکال کر اس کی طرف پھینک دیا۔ احوبہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے اٹھا کر چوم لیا۔ عمر میں پہلی دفعہ وہ اپنا تمام نسائی عجز اور کمزوری عریاں ہوتے دیکھ رہی تھی۔

جب وہ واپس آئی تو اُس نے خیمے کے سامنے توک کے درویش کو مراقبہ میں محو پایا۔

"مَیں نے پا لیا ہے۔ مَیں نے پا لیا ہے۔" احوبہ اسے دیکھتے ہی پکار اُٹھی۔

درویش نے اپنا سر اُٹھایا اور اُس کی طرف دیکھا۔

"واقعی؟"

"کل تم دیکھ لو گے کہ میں کس طرح اس لوز کو اپنی جان کی تہوں میں چھپائے بیت المقدس واپس جاتی ہوں۔"

اس شام دو ستارے ایک دوسرے کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ احوبہ کے دل میں لافانی خوشی کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔

دوسرے دن سورج افق سے ابھی ایک نیزہ بلند تھا۔ چاہ زمزم پر سفید کبوتر

پھڑپھڑا رہے تھے اور عرار نجد کی کلیاں اپنی یک روزہ زندگی کے آخری سانس لے رہی تھیں کہ ایک عربی سردار سیاہ گھوڑے پر سوار احوبہ کے خیمے کے باہر کھڑا تھا۔ احوبہ دوڑ کر باہر نکلی اور اس کی رکابیں تھام لیں۔ وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

"میرے معزز سردار اور محسن مہمان کے لئے خیمہ منتظر ہے۔"

خیمہ بہترین ایرانی اور رومی صناعت سے سجا ہوا تھا۔ مشرق کے ملائم ترین ریشم کے پردے لٹک رہے تھے۔ عود و عنبر کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں اور سونے کے طشتوں میں دمشق کی کھجوریں، حجاز کے انگور اور شام کے انار چُنے ہوئے تھے۔ چاندی کے مٹکے قسطنطنیہ کی قیمتی شراب سے لبریز تھے۔

"میرے معزز مہمان کیلئے نبیذ مناسب مزاج ہو گی۔ یہ ایرانی دوشیزاؤں کے ہاتھوں کی تیار شدہ ہے۔ اور اس میں ہاتھیوں کے ملک کے مسالے ملے ہوئے ہیں۔ یہ روح و بدن کی تھکاوٹ دُور کرتی ہے۔" اس نے چاندی کی ایک منقش مینا سے جام بھرتے ہوئے کہا۔

عرب نے طلائی پیالے کو منہ سے لگا لیا اور ایک ہی جرعہ میں اُسے خالی کر دیا۔ اس کی سیاہ بلوریں آنکھوں میں ستارے جگمگا اُٹھے۔ اس کے بعد احوبہ نے اجازت لی اور تبدیلیٔ لباس کیلئے دوسرے خیمے میں آ گئی۔ یسمیہ صندلی آئینہ لئے بیٹھی تھی۔ احوبہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ یسمیہ نے یمنی زیتون کا تیل اس کے سر میں ڈالا۔ اور اس کی لٹوں میں بحیرۂ احمر کے خوشاب موتی پرونے لگی۔ پھر اس نے طلائی تاروں سے

گندھا ہوا موباف اس کے ریشمیں اور چمکیلے بالوں میں باندھ دیا۔

احوبہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ہونے والے حادثہ کے تخیّل سے مست ہو رہی تھیں۔ پھر سمیّہ نے اطلس کا وہ لباس نکالا جس کے اندر ایران کے بکصد کاریگروں نے اپنے ناخنوں سے سونے کے تار پروئے تھے۔ احوبہ نے اپنے گلے میں دجلہ و فرات کے باریک گھونگھوں کی مالا ڈالی۔

وہ زینت و آرائش سے فارغ ہو چکی تو سمیّہ ایک نقرئی صندوقچی لے آئی۔

"ہر مقدس کی بیٹی۔ میں اپنے ساتھ بیت المقدس کی خاک لیتے آئی تھی۔ یہ اپنی تاثیر سے تمہیں اپنے پاس بلا لے گی۔"

سمیّہ نے مٹی کی ایک چٹکی لی اور اس کے لباس اور بالوں پر چھڑک دی پھر احوبہ تبوک کے درویش کے پاس آئی۔ وہ مراقبہ میں بدستور محو تھا۔

سورج ریتیلے افق میں آہستہ آہستہ دھنس رہا تھا۔

"مقدس راہب گواہ رہیو، میں موسیٰ و عزیر کی ناموس بیت المقدس واپس لئے جا رہی ہوں۔"

احوبہ نے عرب کے خیمے کی طرف قدم اٹھایا۔ لیکن درویش نے ایک لمحہ توقف کا اشارہ کیا۔ "اس کے قریب ہوتے ہوئے دیکھ لینا کہ وہ تمہارے بھی ویسے ہی قریب ہو گئے ہیں یا نہیں۔"

جب وہ اندر داخل ہوئی تو عرب مردانگی کا جوہر نرم قالینوں پر لیٹا ہوا انگور

کے خوشے سے انگور مُنہ سے توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔

"میں آگئی ہوں، لالۂ صحرا۔"

اس نے لیٹے لیٹے اس کی طرف دیکھا اور انگور کھانے میں مشغول رہا۔

احوبہ اُس کے پہلو میں بیٹھ گئی: "میں تمہیں خوابوں میں دیکھا کرتی تھی۔ مجھ کو معلوم نہ تھا کہ تم فاران کے سایہ تلے ملو گے۔"

عرب بولا: "اے ارضِ مقدس کی پروردہ، تمہیں سرزمین بطحا خوش آمدید کہتی ہے" "عزیز سرواد، یہ خاک تمہارے نورہی سے روشن ہے۔"

قریشی نے دوشیزہ کی طرف دیکھا۔ عرب کو کسی کے منہ سے اپنی تعریف سننا گوارا نہیں۔ وہ اپنی تعریف سننا پسند کرتا ہے تو صرف اپنی زبان سے ورنہ مطلقاً نہیں۔

احوبہ نے ایک جام بھرا جسے وہ غٹا غٹ کر کے پی گیا۔

صحرا کے آسمان پر سیاہی کے پردے تن رہے تھے۔ دم بدم احوبہ کا دل گرتا ابھرتا اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ تختۂ دار پر چڑھ رہی تھی۔ عورت ناکامی کو دیکھنے کی بجائے اپنی آنکھیں بند کر لینا زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ اگرچہ اندھیرا چھا رہا تھا لیکن وہ آسمان کی جانب آنکھیں اُٹھانا نہیں چاہتی تھی۔

عرب مہمان اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اس کے چہرے کے قریب آ رہا تھا۔ احوبہ کھڑی ہو گئی: "ذرا ٹھہرو" وہ دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔ اُس کا دل زور زور سے کانپ رہا تھا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھنا نہ چاہتی تھی، لیکن اس کی آنکھیں خود بخود

اُٹھ گئیں مگر —— وہاں تو صرف ایک ہی ستارہ اپنی لافانی تابانی سے چمک رہا تھا۔ اس کا سر چکرا گیا۔

"تم شادی شدہ ہو؟" احوبہ نے خفیف آواز میں پوچھا۔

"ہاں"۔

"تم کل رات اپنی بیوی سے ملے تھے؟"

"ہاں" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ ملاقات عرصۂ دراز کے بعد تھی"۔

"پھر یہاں سے نکل جاؤ"۔ احوبہ یکایک چیخی۔ وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھی اور پھلوں سے بھرے ہوئے طشت اُلٹ کر اُسے باہر دھکیلنے لگی "نکل جاؤ۔ نکل جاؤ"۔ وہ چمگادڑ کی طرح چیخ رہی تھی۔ عرب متحیر پھٹی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا

"یہ لو اپنا خنجر۔ نکل جاؤ"۔

اُس نے عرب کا طلائی خنجر اپنی آستین سے نکالا اور اُس کے منہ پر زور سے دے مارا۔

"میں تمہیں ہرگز ہرگز دیکھنا نہیں چاہتی"۔

عرب کوئی لفظ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس کے گھوڑے کی ٹاپیں گہری سیاہی میں گونج کر ڈوب گئیں۔

رات نوحہ خواں عورت کی طرح بال کھولے آسمان پر پھیل رہی تھی۔ چمکدار ستارہ روشن آنکھ کی طرح زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنے قریب سے احوبہ نے گویا ہنسی کی

آہٹ سنی۔ اس نے تبوک کے درویش کی طرف دیکھا۔ وہ ستارے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اجوبہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "یا یہود، یا یہود"

۵

دنوں کا سفر مہینوں میں کٹ رہا تھا۔ اب اجوبہ کے لئے کونسا ٹھکانہ تھا؟

وہ ابھی حجاز کی آخری سرحد ہی تک پہنچی تھی کہ اُس نے قافلے والوں کی زبانی سن لیا کہ کعبہ کے تین سو ساٹھ بت ایک دن اوندھے گر گئے اور نوشیرواں کے ملوکی محل کی بُرجیاں ایک زلزلے سے سرنگوں ہو گئیں۔

اُس نے ساربان کو پھر مکہ لوٹنے کا حکم دیا۔

جب وہ منیٰ کے قریب پہنچی تو اس نے اونٹنی روک لی۔ اس کی صورت تو پہلے ہی بدل چکی تھی، اس نے اپنا لباس بھی بدل لیا۔ اسی حالت میں وہ مکہ میں داخل ہوئے۔ اب وہ پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اور سمیہ آگے آگے۔

سمیہ نے ایک عورت سے پوچھا "محترمہ جس دن کعبہ کے بت گرے تھے۔ اس دن کس گھر میں بچہ پیدا ہوا تھا؟"

عورت نے انگلی سے ایک خستہ حالت کچے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں مکان کی طرف بڑھیں۔ اس مکان کی دیواریں قدِ آدم سے کچھ ہی بڑی ہوں گی۔ انہوں نے کھٹکھٹائے بغیر دروازہ کھول لیا اور اندر داخل ہو گئیں۔ کچی کوٹھڑی کے اندر نور کی اِک شمع جل رہی تھی۔ وہی عورت جسے ایک دن اُس نے ببول کے درخت کے نیچے دیکھا تھا۔ اپنی گود میں ایک بچہ

لئے بیٹھی تھی۔ ۔ احوبہ نے اسکی طرف دیکھا اور یک بیک اُس کا دل ایک چنگاری سے سلگ اٹھا۔ وہ اس منظر کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ اس کا سر چکرانے لگا اور وہ باہر نکل آئی۔

پُورے ترپن ۵۳ برس بعد ایک نئی اُمت جو اپنے آپ کو ملت ابراہیم کہتی تھی اور اپنے لئے مسلم کا لفظ پسند کرتی تھی۔ پورے ایک ماہ کے روزے رکھ رہی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ انہوں نے اپنی زندگیاں خدائے ارض و سموات کے ہاں رہن رکھ دی تھیں۔ اُن کے نزدیک فرمانروائی کا حق کسی انسان کو نہ تھا بلکہ یہ حق صرف اسی کے لئے مخصوص تھا جس نے انہیں خلق کیا تھا۔ اور وہ تمام انسانوں کو ایک ہی جڑ کی شاخیں تصور کرتے تھے۔ ایک ماہ کے بعد ایک شام یثرب کی انگلیاں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ مسلمان خوشیاں منا رہے تھے اور ان کے ہاتھ دعا میں آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے جب الھڑ لڑکیاں ڈھولکیوں پر جنگ بعاث کے گیت گانے لگیں تو ایک ضعیف بڑھیا یہ شور سُن کر ہانپتی کانپتی چھت پر آئی۔ آسمان کے مغربی گوشے میں ہلال نورِیشمی آسمان پر جھومر کی طرح لٹک رہا تھا۔ یکا یک اُسے یعقوب و اسحٰق کے باپ کی دُعا یاد آئی جو اس نے حرم کعبہ کی اینٹیں چُنتے ہوئے کی تھی۔

”الٰہی! ان انسانوں کے درمیان اپنا ایک رسول بھیجیو، جو ان کو تیری آیات سنائے، انہیں قانون و تدبّر سے روشناس کرائے اور ان کی زندگیوں کو صیقل کر دے، الٰہی! تو ہی غالب اور حکمت والا ہے۔“

(البقرۃ)

ایک دن

سرناظم نے آنکھیں کھول کر اپنے گردوپیش پر ایک نظر ڈالی۔ کمرے میں کافی روشنی ہوچکی تھی۔ اور باہر کی دنیا سے مختلف قسم کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں جن میں کسی بڑھئی کے لکڑی چیرنے کی آواز اور تالاب کے کنارے دھوبی کی چھوا چھو زیادہ نمایاں تھی۔ وہ آہستہ سے بیٹھ گیا اور اپنے پلنگ کے گرد زعفرانی رنگ کے پردوں کو ہٹایا جو پلنگ کے چاروں طرف ایک گھنٹی کی شکل میں لٹک رہے تھے۔ پردوں کے ہٹتے ہی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ جو اس کے جسم میں کپکپی سی پیدا کرتا ہوا روشن دان میں سے باہر نکل گیا۔ کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے پھولدار پردوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔

سرناظم تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے جسم کو کمبل سے خوب

ڈھک لیا۔ اس کے ہونٹوں پر خشکی سے پپڑی سی جمی ہوئی تھی۔ اس کے اندر معدے سے لے کر سینے تک اک آگ سی لگ رہی تھی بالکل ایسی جیسی کہ انگیٹھی کے بجھ جانے کے بعد کمرے میں گھٹی گھٹی سی گرمی رہ جاتی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر خشک زبان کو پھیرا۔ لیکن مزا پہلے سے بھی بدتر ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہؤا گویا اس کے حلق کے نیچے نیم کا پتّا اتر گیا ہو۔

سر ناظم نے پلنگ کے دائیں طرف دیوار میں لگی ہوئی گھنٹی بجائی اور تھوڑے ہی وقفہ کے بعد برآمدے میں محتاط قدموں کی دھمک سنائی دی۔

"پانی" امیر آدمی چلایا۔

جب وہ پانی پی چکا تو اس نے قدرے سکون محسوس کیا۔ پانی بھی اگرچہ کڑوا تھا تاہم اس نے اس کی آگ کو کچھ وقت کے لئے ضرور بجھا دیا۔

سورج کی روشنی اب کھڑکی کے پھولدار پردوں میں سے چھن چھن کر ایرانی قالین پر لوٹ رہی تھی۔ ایک ننھا سا پرندہ کھڑکی میں بیٹھ کر چہچہانے لگا۔

سر ناظم کی نظریں کمرے میں چاروں طرف دوڑ رہی تھیں۔ لیکن اس کا دل صرف ایک ہی خیال میں محو تھا "میری طبیعت میں سکون کیوں نہیں پیدا ہوتا؟" اس کا ہاضمہ پورے دس برس سے خراب تھا۔ اور اسی وجہ سے سفیدی وقت کی سی سرعت کے ساتھ اس کے بالوں میں سرایت کر رہی تھی۔ شاید وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی عمر ابھی کیا تھی؟ صرف پینتالیس سال! اس کی عمر کے لوگ تو عقد ثانی کی تیاریاں کر رہے

تھے طبیب کہتے ہیں ضعفِ معدہ کی زیادتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے پیشاب کے ساتھ شکر آرہی ہے۔ اور ایک ایورویدک سنیاسی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ کثرت ملاعبت اور روغن دار غذاؤں کا نتیجہ ہے۔

معاً دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟"

"ڈاکٹر!"

"آیئے" اس نے انتہائی اکراہ کے ساتھ اجازت دی۔ اس نے سوچا اب وہ آئے گا اور ایک بے رحم قصاب کی طرح میرے جسم کی ایک ایک بوٹی کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھے گا۔ اس کے بعد ایک بیماری کا لمبا سا لاطینی نام لے دے گا۔

ڈاکٹر کا مسرور چہرہ پردوں میں سے نمودار ہوا۔

"صبح بخیر"

اس نے آتے ہی اپنی ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی اور اپنا چھوٹا سا دستی بیگ کھول لیا۔

"رات کیسے گذری؟"

پھر ڈاکٹر نے اُسے لٹا دیا اور اس کے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر اپنی ٹھنڈی انگلیاں اس کے گرم پیٹ میں پیوست کر دیں۔ ایک جھرجھری سی اس کے جسم میں پیدا ہوئی۔ اسکا جی چاہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی انگلیاں پکڑ کر مروڑ ڈالے۔ پھر ڈاکٹر نے اس کو زبان باہر نکالنے

کے لیے کہا۔

"ہوں۔" ڈاکٹر نے اپنا آلہ پھر بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "زبان سخت گندی ہے رات کیسے گذری ؟"

"رات !" رئیس کے چہرے پر جھریاں سی پڑ گئیں۔ اس کے ذہن میں کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو رات کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ "ایک بے چینی سی رہتی ہے۔ جو دل سے اُٹھتی ہے اور تمام جسم پر طاری ہو جاتی ہے۔"

اس کی زبان پر کڑواہٹ پھر پھیل گئی۔

"کوئی فکر کی بات نہیں۔ شکر کے اخراج سے دل بھی متاثر ہوتا ہے۔ گھوڑے کی سواری جاری رکھئے۔"

ڈاکٹر مسکرایا اور اس کے سفید دانت چمکے۔ روشنی کی ایک پتلی سی لکیر اس کے چمکیلے بالوں میں کھنچی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر زندگی کی رونق برس رہی تھی۔ بشر ناظم دل ہی دل میں اس پر رشک کرنے لگا۔

"ڈاکٹر" بشر ناظم نے نہایت پُر یاس لہجے میں کہا۔ "میرے دل سے یقین روز بروز اُٹھ رہا ہے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے گویا دُنیا ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔ جس میں اتفاق سب سے اہم کام کر رہا ہے۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ آپ ڈاکٹر بن گئے اور میں ایک مریض۔"

ڈاکٹر پھر مسکرایا گویا وہ یہ سُن کر خوش ہوا کہ اتفاق سے اُسے ایک اچھا کام

مل گیا۔" مایوس نہ ہو جئے، سب کچھ جلدی ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ اب کے موسم گرما آپ کسی پہاڑی مقام پر بسر کریں تو بہتر رہے گا۔"

اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور بیگ لے کر رخصت چاہی۔

اس کے بھاری بوٹ سنگِ مرمر کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے چلے۔ جب وہ لکڑی کے زینوں سے نیچے اُترا تو زینہ اس کے پاؤں کی دھمک سے چرچرا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ خاموشی پھر چھا گئی۔ صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ جو وقت کے فیتے کو وقفوں میں کترتی جا رہی تھی

معاً دروازہ کھُلا اور خادم نے ناشتے کی اطلاع دی۔

"بیگم میز پر پہنچ گئی ہیں؟"

"بس آ رہی ہیں حضور۔"

سرِ ناظم آہستہ سے اپنے بستر سے نکلا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بال اس طرح مٹیالے ہو رہے تھے گویا بچوں کے ساتھ دھول میں کھیلتا رہا ہو۔ اس کی بھاری مونچھوں کا بل نکلتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ لیکن ان میں وہ بل پیدا نہ ہوا۔ اس کی کنپٹی کے قریب سفید بالوں کا ایک گچھا بھٹے کے بھٹوں کی طرح اُبھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں میلی میلی سی نظر آ رہی تھیں۔

اُس نے کپڑوں کی الماری کھولی اور نیلے لباس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر اُسے خیال آیا۔ اسے کہیں باہر تو جانا نہیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنا مخملی گون پہن لیا۔

جب وہ کھانے کے کمرے میں آیا تو میز پر صرف بچے ہی بیٹھے تھے، وہ اپنے باپ کو دیکھتے ہی اس کی طرف دوڑے اور اس سے لپٹ گئے، اس نے دونوں کو چوما اور ان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہاری امی کہاں ہیں؟"

"سنگار روم میں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"تم نے 'چمکو ننھے ستارے چمکو' کی نظم یاد کی ہے؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

لڑکے نے اپنی بھوری آنکھیں اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا اور چمچے سے کھیلنے لگا۔ اس کے رخساروں پر ہلکا سا گلابی رنگ دوڑ گیا۔

"ابا جان" لڑکی کرسی پر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی "نسیم کل سارا دن ندی کے کنارے کیچڑ میں کیچوے پکڑتا رہا۔"

"نہیں ابا جان" نسیم نے فرزانہ کی طرف گھور کر دیکھا "فرزانہ ہی نے تو مجھے اس کے لئے کہا تھا۔"

سر ناظم نے فرزانہ کی طرف دیکھا۔ اس کے بالوں میں سرخ فیتے کا پھول بندھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے باپ کی بغل میں سر چھپا لیا۔

"شریر لڑکی" اس نے اس کے سر کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا "بتاؤ تم نے نظم یاد کی؟"

"ہاں ابا جان۔" اس نے چمک کر کہا اور نظم سنانے لگی۔ جب وہ نظم سنا چکی

تو نسیم نے کہا۔ "اچھا اب تم کوّے اور مور کی نظم سناؤ تو۔"

لڑکی چپ ہو گئی تو نسیم نے کہا۔ "ابّا جان میں سناتا ہوں۔"

اتنے میں بچوں کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ لاجونتی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اور اس کے گلے میں موتیوں کا ہار جھلمل کر رہا تھا۔ جونہی وہ کرسی پر بیٹھی ایک مہک سی ہوا میں پھیل گئی۔

"کیا شور مچا رکھا ہے بچو تم نے اگر چائے پی لی ہے تو اسکول کو بھاگ جاؤ۔" پھر اس نے خاوند کی طرف دیکھا۔ "آپ سنائیے کیسی طبیعت رہی ہے؟"

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ تیس برس کی عمر میں بھی جوان تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر آنے والی عمر کا ایک نشان بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ابھی تک جوان کلی کی طرح چٹک رہی تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میں مس تھامسن کے ہاں جا رہی ہوں۔ آج اس نے اپنے چند ایک دور کے رہنے والے دوستوں کی ضیافت کی ہے۔ شاید میں چار بجے کی چائے تک نہ لوٹ سکوں۔"

جب وہ بات کر رہی تھی تو اس کے کانوں کے بندے اس کی آنکھوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔

بچوں نے چائے ختم کر لی تو اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے

اپنے اپنے بستے بغل میں داب، اور برآمدے میں سے بھاگتے ہوئے نکل گئے۔ ان کے ہلکے پھلکے قہقہوں کی آوازیں دیر تک ان کے کانوں میں آتی رہیں۔

ماں نے چائے کی پیالی طشتری پر رکھتے ہوئے کہا "ان کی استانی کل مجھ سے کہہ رہی تھی کہ فرزانہ نسیم سے زیادہ ذہین ہے۔"

"ہاں" سرناظم نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے سامنے انڈے، دلیا اور دودھ میں ڈبل روٹی کے بھیگے ہوئے ٹکڑے پڑے تھے۔ لیکن وہ ان میں سے ایک چیز بھی نہ کھا سکا، اس نے دلیے کا ایک چمچہ لیا۔ لیکن فوراً ہی ڈکاریں آنا شروع ہو گئیں۔ اس کے سامنے اس کی پیالی پڑی تھی۔ جس میں چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

"آپ کچھ کھائیں گے نہیں، تھوڑا سا پھل ہی کھائیے۔"

اس کی بیوی نے سنگتروں کی پلیٹ اس کے سامنے کھسکا دی۔ اور خود ایک سیب چھیلنے لگی۔ سرناظم نے بیوی کی تالیف قلب کے لئے ایک سنگترہ اٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔ اس کی نظریں بار بار اس کے چہرے کی جانب اٹھ رہی تھیں جس پر غازے کی گرد احتیاط اور ہنر مندی سے چھڑکی ہوئی تھی۔

جب اس نے سیب چھیل لیا تو ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اپنے خاوند کو پیش کیا۔

"شکریہ" سرناظم نے سنگترے کی ایک پھانک کھاتے ہوئے کہا۔

"سیب تو ایسی چیز نہیں جس سے انکار کیا جائے۔"

اس فقرے نے اس کے ذہن میں یکایک سوئی ہوئی ایک یاد کو بیدار کر دیا پندرہ برس ہوئے جھیل ڈل کے کنارے ایک انگریز نژاد ہندوستانی لڑکی نے اس سے یہی فقرہ کہا تھا۔ وہ بھی کیا وقت تھا۔ اس نے ایک آہ بھر کر سیب لے لیا۔ اور آہستہ آہستہ چبانے لگا۔

پھر اس کی بیوی نے خادم کو بلایا اور چائے کے برتن اٹھا لے جانے کے لئے کہا۔ اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مسٹر ناظم اٹھ کر کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ نیچے باغ میں مالی کیاریوں کو پانی دے رہا تھا۔ رگیں کو ڈکاریں آنے لگیں۔ زبان پر کدلی سی کڑواہٹ پھیل گئی۔ اور اس کے سینے میں آگ کی ایک بھٹی سی دہکنے لگی۔

وہ جلدی سے پلٹا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

میز پر ڈاک پڑی تھی۔ اس نے پہلا خط اٹھایا۔ یہ روئی کے ایک کارخانہ کے مالک کی طرف سے تھا۔ جس میں اس نے اس کی زمینوں کی تمام کپاس کو بازاری نرخ سے دو آنے زیادہ پر خریدنے کی پیش کش کی تھی۔ دوسرا خط ایک دوست کی طرف سے تھا۔ جس میں اس نے مرغابی کے شکار کی دعوت دی تھی۔ تیسرا خط ایک کتب فروش کی طرف سے تھا۔ جس میں اس نے اس کے مذاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک نئی مطبوعہ کتاب کے چند ورق نمونتاً ارسال کئے تھے۔ کتاب کا نام تھا "حُسنِ عالم" اس میں دنیا کے مختلف ملکوں کی عورتوں کے عریاں حسن کی تصاویر تھیں۔

سرناظم نے پمفلٹ میز پر رکھ دیا اور اپنا پائپ سلگایا۔ پھر اپنی دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا کر اِن تصاویر کو از سرِ نو دیکھنے لگا۔ جب وہ انہیں غور سے دیکھ چکا تو اُس نے ان کاغذات پر ایک سُرخ نشان لگا کر میز کے پہلے خانے میں رکھ دیا۔ اِن خطوں کے نیچے اخبار تھا۔ جس کے ساتھ ایک کارڈ چسپاں تھا۔ کارڈ پر لکھا تھا" ہم احیائے مذہب کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ زمانہ بے حیائی اور جنسی فرسودگی ——" اس نے کارڈ کو اخبار سمیت ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اس کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں لیکن ایک نیلے لفافے نے انہیں صاف کر دیا۔ اُس نے پہلے اس کا پتہ پڑھا۔ پھر خط کو سونگھا۔ انداز تحریر زنانہ تھا۔ کچھ لمحات تک وہ سگار کا کش اور لکھنے والے کے متعلق قیافے لگاتا رہا۔ پھر اُس نے نہایت آہستگی سے لفافہ چاک کیا اور خط کی تہیں کھول کر پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ پڑھتا جاتا اس کے چہرے کی شکنیں صاف ہوتی جاتیں۔ یہ خط میجر پرویش کی بیوی نے اپنے دوست "بوڑھے نواب" کو لکھا تھا۔ "میں دسمبر کی چھٹیاں تمہارے پاس گذاروں گی —— اکیلی آرہی ہوں۔" اُس نے خط کو پھر تہہ کر کے لفافے میں ڈال دیا۔ اور اس کو اپنی گون کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

دروازے پر ایک دستک پڑی۔

"آجاؤ اندر۔"

سرناظم کا سکرٹری اپنی پرانی فلالین کی پتلون اور سُرخ کوٹ پہنے اور چھوٹی سی پگڑی باندھے اندر داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں اکاؤنٹ بک تھی۔ وہ میز کے

قریب کھڑا ہو گیا

"مجھے امید ہے جناب کی طبیعت رات بہتر رہی ہو گی۔"

"ہاں" نواب نے جلدی سے اِس موضوع کو ٹالتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے سکریٹری کے خیریت پوچھنے والے لہجے کو ہرگز پسند نہ کرتا تھا۔ ہمیشہ اس میں اس کو ریاکاری اور خوشامد کی بو آتی تھی۔

"درختوں کے ذخیرے کی زیادہ سے زیادہ کیا پیش کش ملی؟"

"بارہ ہزار روپیہ دہلی کے ایک سیٹھ کی طرف سے کہا گیا ہے۔ بولی آٹھ ہزار سے شروع ہوئی تھی۔"

سکریٹری نے جیب سے اپنی عینک نکالی۔ پھر رجسٹر سے ایک پیلا لفافہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ سر ناظم نے لفافے پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا "تو ہمیں فرنیچر اور عمارت کے لئے عمدہ لکڑی کہاں سے دستیاب ہو سکے گی۔؟"

"ہاں جناب مجھے یاد آیا۔ میں نے اس کے متعلق بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ منصوری کی پہاڑیوں پر عمدہ لکڑی ملتی ہے۔ میرا خیال ہے وہیں کے لکڑی کے کسی تاجر سے گفتگو کرنی چاہیئے۔"

بوڑھا نواب پائپ کے کش لگا رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں میری نئی پہاڑی کوٹھی موسم گرما سے پہلے پہلے تیار ہو جائے۔"

"مجھے امید ہے برف پگھلنے سے پہلے ہی تیار ہو جائے گی۔"

پھر سکرٹری نے اکاؤنٹ بک نواب کے سامنے کھول دی۔

"پچھلے ماہ چودہ ہزار سات سو نو روپے دس آنے تین پائی کی آمدنی ہوئی اور سات ہزار چار سو روپے چھ آنے خرچ ہوئے۔"

نواب کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"اس میں مکانوں اور دکانوں کا کرایہ بھی شامل ہے؟"

"جی ہاں۔ مکانوں اور دکانوں کا کرایہ یہاں درج ہے۔" سیکرٹری نے اپنی سُرخ پنسل سے صفحے کے ایک کالم کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا خرچ کی تفصیل؟"

"یہاں درج ہے۔" سکرٹری نے ورق اُلٹے۔

بیمار نواب کی آنکھوں کے سامنے خرچ کی لمبی تفصیل موجود تھی۔ اس میں پوڈر کریم، ساڑھیاں، بندے، قمیصوں کے کپڑے، گرم کوٹ اور پتلونوں کے کپڑے نئے ٹی سٹ، گارڈن پارٹیوں کے بل، پٹرول، سبزیاں اور ادویات سبھی کچھ تھیں نواب نے غور سے جو ہر چیز کے طلب کرنے والے کا نام پڑھا تو اپنے نام کے سامنے صرف ادویات ہی پائیں۔ اُس کے سینے میں یکایک آگ سلگنے لگی۔ اس نے سگار کا ایک کش لیا اور نہایت مکروہ کڑواہٹ اس کے حلق میں اور اس کی زبان پر پھیل گئی۔ اس نے زور سے تھوکنا چاہا۔ لیکن گھبراہٹ میں کڑوا تھوک بھی حلق کے نیچے اُتر گیا۔

"لے جاؤ اس کو۔" بوڑھے نواب نے جلدی سے کہا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

جب سکریٹری چلا گیا تو اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر رکھ دیا اور چھت کے درمیان لٹکے ہوئے فانوس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بیسویں صدی ہو، انسانی دماغ کی رفعت آسمان کی بلندیوں سے بھی بلند ہو، ہر چیز دست انسانی کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ پھر اتنی ترقیوں اور اوج کمال کے باوجود اس کے روگ کا کسی کے پاس کوئی علاج نہ ہو؟ کتنی ہی مدت سے اس کے دل میں کوئی خوشی نہ سمائی تھی۔

اس نے ایک نظر گھما کر کمرے میں دیکھا۔ انگیٹھی کے کارنس کے اوپر جو ٹیبل لمپ پڑا تھا اس کا خول افریقی شتر مرغ کے انڈے کا بنا ہوا تھا اور سات ہزار روپے میں ایک جرمن سے لیا تھا۔ دیواروں میں جو الماریاں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر خالص ہاتھی دانت کی پچی کاری کی گئی تھی۔ لکھنے والی میز کی لکڑی سوئزرلینڈ کے پہاڑوں سے منگائی گئی تھی۔ یہ میز اس نے اپنے پچھلے جنم دن پر خریدی تھی۔ انگیٹھی کے قریب ایک صوفہ پڑا تھا جس کی قیمت پورے بارہ سو روپے تھی۔ اس کے آگے جو قالین بچھا تھا وہ روس سے آیا تھا اور ایک روسی تاجر سے پورے چار ہزار روپے میں خریدا گیا تھا۔ انگیٹھی کے چاروں طرف صندل کی لکڑی کا حاشیہ لگا ہوا تھا۔ اور اس پر سونے کی گھڑی رکھی ہوئی تھی جس کی قیمت بیس ہزار روپے تھی۔ اس کے ڈائل پر ایک مشہور اطالوی مصوّر نے ایک محو پرواز پری کی تصویر بنائی تھی۔ آہ یہ

سب چیزیں مل کر بھی اس کے لئے خوشی کا ایک لمحہ نہیں لا سکتیں؟

یکایک اپنی پشت پر اس نے ایک مہین آواز سنی۔ "سخی داتا۔"

"کون؟" نواب نے اپنی کرسی پر مڑ کر دیکھا۔ پرانے اور گندے پنسواری رنگ کے لباس میں ملبوس ایک عورت دروازے کی دہلیز میں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اور ایک بالکل عریاں بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا لگا کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور قالین پر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کیچڑ سے لت پت پیروں سے قالین پر بڑے بڑے سیاہ دھبے پڑ گئے۔

"سخی داتا، میں تمہارے ہمسائے میں رہتی ہوں۔ میرا خاوند سبزی فروش ہے وہ اپنے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے ہر روز کچھ نہ کچھ کما لاتا تھا لیکن آج وہ بیمار ہے اور شاید عنقریب ہی وہ موت کی گود میں پہنچ جائے اگر —— اس کی بروقت مدد نہ کی گئی۔"

عورت نے سکون سے پوری بات کہی۔ وہ اپنے سفید ہونٹ چبا رہی تھی۔ جن کا خون مدت ہوئی نچڑ چکا تھا۔ وہ جوان ہی دکھائی دیتی تھی، لیکن اس کی جوانی کہاں تھی؟ وہ اپنی بجھے کوئلے کی سی ٹھنڈی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نواب کے سینے سے غصے کا ایک بگولا اٹھا اور اس کے حلق میں اٹک گیا۔

"تمہیں کس نے اندر آنے کی اجازت دی؟" نواب نے سختی سے پوچھا۔

"میں آنکھ بچا کر اندر چلی آئی۔"

نواب نے غضب آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "نکل جاؤ۔"

وہ بجائے پلٹنے کے دو قدم اور آگے بڑھ آئی۔ اور اس کے ہر قدم کا نقش قالین پر ثبت ہوتا گیا۔

"اللہ نے تمہیں ہر شے دی ہے —"

نواب نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ اس کے ہاتھ میں آیا اس کی طرف پھینک دیا۔ عورت نے بغیر دعا دیئے اس کو اٹھا لیا اور باہر نکل گئی۔

جب وہ چلی گئی تو سر ناظم نے زور سے گھنٹی بجائی۔

دروازے میں ایک نوکر نمودار ہوا۔

"حرام زادے تم اندھے تھے، وہ اندر گھس آئی، قالین صاف کرو۔" نواب نے پورے زور سے کڑک کر کہا۔ اور اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا نوکر نے جلدی سے قالین صاف کیا اور چلا گیا۔ مگر اس کا دل پھر بھی دھڑکتا رہا۔ نواب نے آہستہ سے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

"آہ، میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں۔"

اس نے نیا پائپ سلگایا اور اپنی کرسی کتابوں کی الماری کے قریب کھینچ لی۔ الماری میں ہر قسم اور ہر موضوع کی کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ اس نے تاریخ کی ایک

جلد اٹھائی۔ دو چار ورق اُلٹے اور پھر اُسی جگہ رکھ دی۔ پھر ایک ناول اٹھایا، ورق گردانی کی لیکن سر چکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کتابوں کی سُنہری جلدیں قطار در قطار کھڑی تھیں۔ لیکن اس کا دماغ صرف ایک ہی بات کی ٹوہ میں مصروف تھا۔ "مجھے خوشی کیوں حاصل نہیں ہوتی؟" بڑے بڑے مفکروں نے کہا ہے زندگی کیا ہے؟ —— مسرت کی تلاش! جہاں بھی ملے اُسے لے لو لیکن وہ بچارا کیا کرے جو مسرّت کو تو ڈھونڈھ رہا ہے لیکن اسے معلوم ہی نہیں کہ مسرّت کس کونے میں چھپی ہوئی ہے؟ کیا اس کی ساری عمر کا مقصد صرف تلاش مسرّت ہی رہے گا۔ اور جب وہ سچّی خوشی کی نشانی پالے گا تو پھر اس کی موت آجائے گی۔ یہی زندگی ہے کیا؟

پھر اس نے اُٹھ کر الماری سے بہترین تصویروں کی کتاب نکال لی اور دیر تک نسوانی حُسن کی عریانی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب اس نے کتاب بند کی تو اس کا سر ڈگمگایا، سینے میں ایک انگیٹھی سی دہکنے لگی اور زبان پر کڑواہٹ پھیلنے لگی۔

گھڑی نے چار بجائے اور خادم نے چائے کی اطلاع دی۔

"میں چائے نہیں پیوں گا۔ میں باہر سیر کے لئے جاؤں گا۔ گھوڑا تیار کرو۔" نواب نے کہا۔

سُورج اس وقت افق کو چھوڑ رہا تھا جب نواب سیر سے واپس آیا۔ لوٹتے ہوئے وہ لندن کلب کے قریب سے گذرا۔ اس کے دوستوں نے اسے وہاں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے اصرار اور التجاؤں کے باوجود رکا بھی نہیں۔ جھیل کے اوپر

سے چکر کاٹ کر وہ گھر پہنچا۔ اپنی کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے اس کے ماتھے پر پسینے کے چند قطرات کھڑے تھے۔ جب وہ باغ میں داخل ہوا تو اس کی بیوی فرزانہ کے ساتھ سامنے سے اس کے استقبال کو نکلی۔ وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور فرزانہ کو گود میں اٹھا لیا۔ پھلواری کے پرلی طرف سے نسیم دوڑتا ہوا آیا۔

"ابا جان آپ آ گئے ہیں آپ کو ایک چیز دکھانے آیا ہوں۔ یہ دیکھئے"۔

نسیم نے نزدیک آتے ہی اپنی نئی بندوق سے آسمان کی طرف فائر کیا۔ یکایک جو دھماکا ہوا تو گھوڑا بدکا اور ایک دم باہر کو دوڑا۔

"نوکرو"

چار پانچ نوکر گھبرائے ہوئے نکل آئے اور گھوڑے کے پیچھے اٹھ بھاگے۔ نواب خود بھی کوٹھی کے باہر آن کھڑا ہوا اور اضطراب سے گھوڑے کی طرف دیکھنے لگا جو سڑک پر سیدھا سرپٹ جا رہا تھا پھر کچھ فاصلے پر جا کر یک دم اتنا بل کھاتی تھی کہ دوسری طرف سے آنے والا اس طرف سے جانے والے کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ نواب کی آنکھوں کے سامنے گھوڑا سڑک پر مڑا اور سامنے سے ایک سائیکل سوار بھی نمودار ہوا۔ گھوڑا اس تیزی سے مڑا کہ سائیکل سوار سنبھل نہ سکا۔ اور سیدھا گھوڑے کے پاؤں میں آ رہا۔ گھوڑے کے سموں سے آگ کے شرارے نکلے اور وہ اس کو روندتا ہوا نکل گیا۔

نواب نے جب یہ دیکھا تو فوراً کوٹھی کے اندر چلا آیا۔ برآمدے میں جا کر بیٹھ گیا۔

سورج اس وقت غروب ہو چکا تھا اور آسمان پر سیاہی چھا رہی تھی جبکہ اس کے نوکر گھوڑے کو پکڑ کر لائے۔ گھوڑے کے جسم پر جا بجا خراشیں آچکی تھیں۔ اور اسکے بائیں گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا۔

نواب نے فوراً ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا اور جب تک ڈاکٹر کی کار نظر نہ آئی وہ انتہائی اضطراب سے باغ کی روش پر ٹہلتا رہا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ اُس نے اپنے میٹھے الفاظ سے اس کی دل جوئی کرنی چاہی۔ لیکن نواب نے سیاہ افق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "امینہ سچ ہے۔ اس دُنیا میں کوئی بھی سُکھی نہیں، غم ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے"

اسی اثنا میں ڈاکٹر کی کار دروازے میں نمودار ہوئی تو سر ناظم لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے خود کار کا دروازہ کھولا۔

ڈاکٹر نے گھوڑے کو بغور دیکھا اور اس کے زخموں پر مرہم لگایا اور اندرونی طور پر پلانے کے لئے دوائی بھیجنے کا وعدہ کر کے چل دیا۔

"نواب صاحب آپ متفکر نہ ہوں، گھوڑے کو زیادہ چوٹیں نہیں آئیں" ڈاکٹر نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر، آپ نہیں جانتے کہ یہ گھوڑا مجھے کتنا عزیز ہے۔ میں نے اسے آٹھ ہزار روپے میں خریدا تھا اور پورے ڈیڑھ سو روپے ماہوار اس کی خوراک کے لئے دیتا ہوں۔ یہ مجھے جان سے زیادہ محبوب ہے"

رات کے کھانے کی اطلاع جب نواب کو دی گئی تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اور سگار سلگا کر کرسی پر بیٹھ کر سوچتا رہا۔ اس کی بیوی آئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر بولی: "پیارے آپ نہ کھائیں گے تو میں بھی نہ کھاؤں گی۔"

"آمنہ، ضد نہ کرو۔ میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔" نواب نے ذرا خفگی سے کہا۔

"اچھا تو میز پر چل کر ہی بیٹھ جائیے۔"

چنانچہ وہ بیوی بچوں کے ساتھ میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ بڑی خاموشی سے کھانا کھایا گیا، بیوی بچے کھانا کھاتے رہے اور نواب سگار پیتا رہا۔ کھانے کے بعد آمنہ نے بچوں کو انگیٹھی کے پاس کھیلنے کی بجائے بستروں میں دبک کر پڑ جانے کے لئے کہہ دیا۔ نواب کمرے میں آ کر بستر میں لیٹ گیا لیکن کھلی کھڑکی میں سے تاریک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ رات میں دو بار اُٹھ کر وہ اصطبل میں گیا اور گھوڑے کو پورے غور سے دیکھا۔ دوسری بار جب وہ کمرے میں واپس آیا تو یکایک اس کا جی پھر متلانے لگا۔ معدے سے لے کر سینے تک اک آگ سی لگ گئی اور زبان پر نہایت مکروہ کڑواہٹ پھیل گئی۔ وہ پھر سوچنے لگا: "سچی خوشی کیسے ملے گی؟"

دیواروں کے پیچھے

کئی برس کی بات ہے۔ وہ اس وقت نل کے پاس کھڑی ماش کی دال کھنگال رہی تھی۔ وہ ساٹن کی نسواری رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ اور سر پر جالی دار دوپٹہ اوڑھے ہوئے۔ دو عورتیں گھر میں داخل ہوئیں۔ ایک جو معمّر تھی، صرف ایک چادر اوڑھے ہوئے تھی اور دوسری برقعہ پوش تھی۔ برقعہ پوش شکل وصورت سے کسی اچھے گھر کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ ان کے پیچھے ایک تین سالہ بچہ بڑے پیارے اور بھولے بھالے انداز سے قدم اٹھاتا ہوا داخل ہوا۔ وہ بچہ اس کے قریب ہی رُک گیا۔ اور عورتیں آگے دالان میں چلی گئیں۔ جہاں اس کی ماں بیٹھی پیاز کتر رہی تھی۔ اس کی ماں جلدی سے اُٹھی اور ان کے لئے چارپائی بچھادی۔ جس پر وہ بیٹھ گئیں۔

"سلیمہ" اس کی ماں نے آواز دی: "بیٹی ذرا ہنڈیا میں ڈوئی تو پھیر دینا میں یہاں

مہمانوں کے پاس بیٹھی ہوں۔"

اس نے دال دھو لی تو ہنڈیا کے پاس جا بیٹھی جس کی بھاپ میں سامنے رکھی ہوئی ڈلیا کانپتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے گوشت کو چمچے سے ہلایا اور اس میں دال ڈال دی۔

دالان میں عورتیں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہی تھیں۔ وہ کس لیے آئی ہیں ؟ اس سے قبل وہ ان کے ہاں کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھیں۔ وہ برقعہ پوش عورت کون تھی ؟ یہ سوچ کر سلیمہ خود ہی جھینپ گئی۔ چھت کی منڈیر پر ایک پہاڑی کوّے نے بھیگی ہوئی آوازمیں کائیں کائیں کی اور اپنے پر جھٹک کر اڑ گیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر بادلوں کے چند ٹکڑے تیر رہے تھے۔

"سلیمہ" اس کی ماں نے پھر پکارا۔ "بیٹی ایک تھالی تو مجھے دینا میں پیاز رکھوں۔" تھالی دینے کے لئے اس کو عورتوں کے پاس سے ہو کر گزرنا پڑا جونہی وہ ان کے قریب سے گزری تو ماں نے کہا "تمہاری خالہ ہیں سلام کرو۔" وہ سلام کر کے رسوئی میں گئی اور ٹوکری میں سے تھالی لینے کے لئے جھکی تو معاً اسے خیال آیا۔ یہ ہر برقعے والی اس کی خالہ کیوں بن جاتی ہے ؟ پھر یونہی اسے محسوس ہوا گویا اس کا چہرہ تمتما اٹھا ہے۔ وہ ان کے قریب سے پھر گذری اور دیوار کی طرف رُخ کئے تھالی رکھ کر چولھے کے پاس آ گئی۔ چولہے میں لکڑیاں تڑک رہی تھیں۔ وہ غور سے دیکھنے لگی آگ کے شعلے بڑی سرعت سے لکڑیاں چبا رہے تھے۔ شعلے رنگا رنگ کے تھے۔

سبز، سُرخ، اور نیلے۔ اس کی ماں اور وہ دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ برقعہ پوش بڑھ کر اس کے قریب آگئی اور برقعہ پہنتے ہوئے اس کی طرف تکنے لگی۔ سلیمہ بدستور شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے آنکھیں اُٹھائیں اور اس کی طرف دیکھا تو وہ ابھی تک اُسے دیکھ رہی تھی۔ سلیمہ نے جلدی سے اپنا چہرہ دوپٹہ میں لپیٹ لیا اور پھر شعلوں میں کھو گئی۔

اس کی ماں ان کے ساتھ ڈیوڑھی تک گئی۔ وہ کہتی سنائی دی: "اس کے ابّا ابھی دفتر سے آتے ہیں تو ان سے سارا معاملہ کہوں گی۔ آپ مطمئن رہیے۔"

جب اس کی ماں ان سے فارغ ہو کر صحن میں آئی تو سلیمہ نے پوچھا: "یہ کون تھیں امّاں؟"

"یہ ٹھیکیدار محمد عظیم کی بیوی تھی۔"

پچھلے پہر جب اس کے ابّا آئے۔ اور کھانے سے فارغ ہو کر حقہ لے کر بیٹھ گئے تو اس کی ماں نے کہا: "وہ ٹھیکیدار محمد عظیم کی بیوی آئی تھی۔"

"کون محمد عظیم" انہوں نے حقّے کا کش لگاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ رحمت اللہ کا بھائی، کٹڑہ جیمل سنگھ میں ان کا مکان ہے۔ ذات کے قریشی ہیں۔"

"کس لئے آئی تھی؟" انہوں نے اسی بے تعلقی سے پوچھا۔

اس کے بعد کی بات سلیمہ نہ سُن سکی۔ وہ سلیپر چٹخاتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھ کر

چھت پر آ گئی۔ شام کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ افق کے کنارے کی عمارتیں لکڑی کے مربع ٹکڑوں کی مانند ایک کے اوپر ایک دھری نظر آ رہی تھیں۔ طوطوں کی ایک ڈار ٹائیں ٹائیں کرتی ہوئی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ وہ کہاں سے آتے ہیں اور کدھر جاتے ہیں، یہ شام کے پرندے؟

آسمان پر سُرخی کے تار بادلوں کی باریک جالی پر پھیلے ہوئے تھے۔

۲

اس واقعہ کے تین ماہ بعد اس کی ڈولی گھر سے نکل رہی تھی۔ گھر کے دروازے سے لے کر گلی کی نکڑ تک اس قدر ہجوم تھا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ ماں نے روتے ہوئے بیٹی کو گلے سے جدا کیا۔ باہر گلی میں ہجوم کا ایک شور سا اُٹھ رہا تھا۔ جس میں باجوں کی تانیں میخوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ نائن نے ہاتھ تھام کر اُسے ڈولی میں اتارا۔ پردے گر گئے اور کہاروں نے ڈولی کندھوں پر اُٹھالی۔ اب وہ اپنے گھر سے اس طرح جا رہی تھی جس طرح بدن میں روح چند دن بس کر نکل جاتی ہے۔

اس کی ڈولی جلد ہی سسرال پہنچ گئی۔ گھر کے دروازے پر ننھی ننھی لڑکیاں زعفرانی لباسوں میں ملبوس پھدک رہی تھیں۔ ایک لمبے بالوں والا سیاہ کتّا اپنے کان لٹکائے دہلیز میں بیٹھا ہوا تھا۔ جونہی ڈولی دہلیز سے لگی۔ گھر میں اک شور سا بپا ہو گیا۔ اس کی ساس، نندیں اور ہمسائیاں دوڑی دوڑی آئیں۔ نندوں نے ڈولی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ ساس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ اور اُسے

باہر نکلا۔ وہ سب خراماں خراماں اسے ایک کھلے کمرے میں لے گئیں۔ جہاں ایک بڑا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ لڑکیوں کا ہجوم چاروں جانب سے اُمڈ رہا تھا۔ وہ قالین پر سمٹی ہوئی میٹھی تھی۔ اور تمام لڑکیاں اور عورتیں اُس پر جھکی ہوئی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت آئی اور اُس نے لڑکی کا گھونگھٹ ذرا سا کھولتے ہوئے کہا: "اے دلہن! ذرا چہرہ تو دکھاؤ۔ ہماری تو آنکھیں بھی راہ دیکھتے دیکھتے پک گئیں!" جونہی اُس کا گھونگھٹ کھلا، سب لڑکیاں یک بارگی ٹوٹ پڑیں: "ہماری چاند سی بھابی!" اس کی نندیں چلاتی ہوئی اُچھلیں۔ اب عورتیں ایک ایک کر کے آ رہی تھیں۔ اور اس کی ہتھیلی پہ چاندی رکھ کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ لیکن ان کے رنگا رنگ شیشوں کے عکس سے کمرہ جگمگا رہا تھا۔

"اے لڑکیو! ہٹو بھی، یہ کیا گھمسان کر رکھا ہے۔ بیچاری دلہن گھٹ کے مر جائے گی۔" اس کی ساس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے زعفرانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا جس کے کنارے پر سنہری گوٹا لگا ہوا تھا۔ اس کے کرتے پر بھی گوٹے کا فیتہ دوڑ رہا تھا۔ اس کی ساس کو چاروں طرف سے مبارکبادی ملنے لگی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس نے کھڑکیوں کے پٹ کھولتے ہوئے کہا۔ "اللہ نے جس طرح مجھ پر فضل کیا ہے اس طرح ہر ایک پر کرے۔"

کمرے میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ سلیمہ نے نظر اُٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ روشنی کی نہریں کھڑکیوں سے بہہ رہی تھیں۔ اس کی سہمی پیشانی

پر جھومر آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔

رات کے وقت اس کو ایک کمرہ میں پہنچا یا گیا۔ کھڑکی کے ساتھ ایک بڑا پلنگ بچھا ہوا تھا جس کے سرہانے موتیا کے چند ہار لٹک رہے تھے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک فانوس لٹک رہا تھا جس کی ہلکی سبز روشنی کمرے میں سکون و امن کی فضا پیدا کر رہی تھی۔ وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کے سامنے کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جس کے اوپر پیپل کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ آسمان پر سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ سڑک پر گھوڑوں کی گھنٹیاں ٹن ٹن کرتی ہوئی آتیں اور گذر جاتیں۔

یک بیک گھبرا کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کہاں تھی ؟ اس کی اماں کیا کر رہی ہوں گی۔ اور اس کے ابا کہاں ہوں گے ؟ باہر ڈھولک بج رہی تھی - اور گیتوں کو تال دیا جا رہا تھا۔ ہلکے پھلکے ٹھٹھے لگ رہے تھے۔ لیکن وہ بالکل تنہا تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس کا گلا گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے ہونٹ چبائے لیکن اس کے آنسو نہ رک سکے۔ وہ پلنگ پر سے اٹھ کر ایک کونے میں آ بیٹھی اور اپنے منہ کو آنچل میں چھپا کر رونے لگی۔

ڈھولک کی آواز رفتہ رفتہ بند ہو گئی۔ قہقہوں کی جھنکار تھکی ہوئی آوازوں میں تحلیل ہو گئی۔ برآمدے میں اس نے بھاری قدموں کی کھٹ کھٹ سنی۔ آہستہ سے دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ چٹخنی لگ گئی۔ پھر کچھ وقفہ تک پاؤں کی چاپ ساکن رہی۔ اور ہلکی سی سیٹی بجتی رہی۔ جیسے نسیم پھولوں سے گزر رہی ہو۔ اس کے بعد کالی

سکوت ہو گیا۔ اور یکایک دو ہاتھ اس کے بازوؤں کو پکڑے ہوئے تھے۔ وہ کانپ اُٹھی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ اپنے آپ سے دُور ہوتی جا رہی ہے بہت دُور۔ اُس کے نتھنے عجیب قسم کی گرم گرم سانسوں سے بھر گئے۔ جیسے کوئی روشن انگیٹھی کے پاس بیٹھا کھولتے ہوئے پانی کو چائے دانی میں انڈیل رہا ہو۔ سڑک پر ایک گھنٹی ٹن ٹن کرتی ہوئی بجی اور اپنے پیچھے سکوت کی گرد بکھیرتی ہوئی چلی گئی۔

۳

اس کا خاوند بلند قامت اور وجیہہ تھا۔ وہ اپنی ستھری عادات کے سبب سب سے ممتاز تھا۔ وہ تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلتا اور بلند آواز سے بولتا۔ شام کو چار بجے جب وہ دفتر سے لوٹتا۔ اور اس کے مضبوط قدموں کی کھٹ کھٹ برآمدے میں سنائی دیتی تو سلیمہ کی آنکھوں میں اک چمک سی پیدا ہو جاتی۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی کوٹ اتار کر کرسی پر پھینک دیتا۔ بُوٹ اتارے بغیر پلنگ پر دراز ہو جاتا۔ اور اپنی لمبی اور سُرخ انگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دیتا۔ اِس طرح اس کے بالوں کی خوبصورت لہروں میں کھڑکی کی روشنی سے اِک چمک سی پیدا ہو جاتی کھڑکی پر جھکے پیپل کے پتّے آہستہ آہستہ تال بجاتے اور وہ باہر دیکھنے لگتا۔

وہ چائے کا دلدادہ اور سگرٹ کا فدائی تھا۔ صبح اُٹھتے ہی اس کا پہلا کام چائے کی پیالی اور سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگانا تھا۔ اس کے سرہانے کی میز پر چائے

کی پیالی دھری ہوتی جس کی گرم گرم سفید بھاپ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں چکر کھاتی اُٹھ رہی ہوتی۔ اور وہ شیو کرتا ہوتا شیو کے بعد چائے کی سرد پیالی ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتار لیتا اور تولیہ لیکر غسلخانے میں گھس جاتا سلیمہ جب ساتھ والے کمرے میں الماری سے اس کے کپڑے نکال کر جھاڑتی ہوتی تو اُسے ہلکی سی سیٹی کی آواز سنائی دیتی۔ جیسے صبح کی ہوا پھولوں میں سے گذر رہی ہو۔

اس کا سسرالی کنبہ کافی بڑا تھا۔ اس کا سسر فوت ہو چکا تھا۔ وہ اپنے پیچھے دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑ گیا۔ بڑا چھوٹے سے عمر میں دس برس بڑا تھا۔ اس کی شادی مارشل لار کے دنوں میں ہوئی تھی۔ اب اس کے بھی چار بچے تھے۔ اس کی بڑی نند اس کی شادی سے پہلے ہی بیاہی جا چکی تھی۔ اور اب اس کے بھی پاؤں بھاری ہو رہے تھے۔ چھوٹی نند کی منگنی ہو چکی تھی نکاح باقی تھا۔ اس کی بڑی نند بڑی خاموش طبع اور شیریں مزاج تھی۔ شادی کے چند روز بعد وہ ایک دن اس سے ملنے آئی اور سلیمہ کو ساتھ لے کر چھت پر آگئی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے بولتی اور ہر فقرے کے بعد ہلکا سا سانس لیکر آگے بڑھتی۔

"اس کی طبیعت تم تھوڑے ہی دنوں میں پا جاؤ گی۔ اس کا پارہ جس تیزی سے چڑھتا ہے اسی تیزی سے اتر بھی جاتا ہے۔" وہ مسکرائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے سفید دانت موتیوں کی طرح چمکے۔ اس کی غزالیں آنکھیں دھوپ کی روشنی میں بھوری

دکھائی دے رہی تھیں۔ "میں تمہیں اس کا ایک بھید بتاتی ہوں۔ جب وہ غصہ میں ہو تو اس کی بات کا مت جواب دو۔ کچھ وقفہ بعد وہ اپنی غلطی خود بخود محسوس کر لیتا ہے۔ اس کا خاصہ ہے کہ غصہ کی حالت میں اس کو جتنا زیادہ ٹوکا جائے اتنا زیادہ وہ جھلّا اٹھتا ہے اس کے باوجود وہ ہم سب کو محبوب ہے بالخصوص اماں کو۔"

وہ چند دن میکے رہ کر پھر سسرال چلی گئی۔ جاتے ہوئے وہ ایک سویٹر جو وہ اپنے لئے بن رہی تھی اُسے دے گئی۔ جب وہ چلنے لگی تو اس نے سلیمہ کو تاکید کی کہ وہ ضرور اس کے ہاں آئے۔ اس کے چلے جانے کے بعد سلیمہ واقعی اُداس ہو گئی۔ عادات کی صفائی میں وہ اپنے چھوٹے بھائی سے بہت ملتی جلتی تھی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر وہ آئینہ کے سامنے اپنے بناؤ سنگار کا ڈبہ لیکر بیٹھ جاتی اور اپنے منہ پر کریم ملنے کے بعد بال گوندھتی۔ پھر وہ چولھے کے قریب آ بیٹھتی۔ اور پکانے والی کی ہر کام میں مدد کرتی۔ اس کی چھوٹی نند رضیہ نے اسے بتایا کہ بیاہ سے پہلے صفیہ ہی نے گھر کا بار اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اس وقت سوتی جب تمام سو چکتے گرمیوں کے موسم میں اپنے کندھوں پر گھڑے اٹھا کر چھت پر لاتی۔ وہ حسین نہ تھی۔ لیکن جاذبِ نظر ضرور تھی۔

دوسری بار جب سلیمہ اسے اس کے گھر ملنے گئی تو چائے پینے کے بعد وہ اسے چھجّے پرلے کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ نحیف سی دکھائی دے رہی تھی۔ چار زینے چڑھنے کے بعد اس کا سانس پھول گیا۔ اور اس کے پھیکے ہونٹوں پر سوکھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

سورج کی روشنی نکھری ہوئی تھی۔ وہ رنگ مکانات خوبصورت نظم کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ اور ان کے آخیر میں بلند گھنٹہ گھر کا قبہ نظر آرہا تھا۔ مکانوں کی چھتوں پر کبوتروں کی چھتریاں تھیں۔ جن کے اوپر سفید کبوتروں کے پرے قلابازیاں لگا رہے تھے۔

تسلیمہ بعض اوقات میں سوچتی ہوں۔ کیا یہ سب کچھ یونہی دھرا رہ جائے گا؟ آخر ہم اس دنیا سے جاتے ہوئے اپنے ساتھ کیا لے جاتے ہیں؟"

سلیمہ مسکرائی۔ صفیہ کی آنکھوں میں ایک بھوری سی چمک پیدا ہو رہی تھی۔ وہ کس قدر صاف ستھری تھی! اس کا چہرہ اس طرح نکھرا ہوا تھا۔ جس طرح سنہری چشمے کا اچھوتا کنول۔

تیسرے دن وہ اپنے گھر لوٹ آئی۔ اس کے پندرہ دن بعد صفیہ کے ہاں ایک مردہ بچی پیدا ہوئی۔ صفیہ اس روز بالکل خیریت سے تھی۔ لیکن دوسرے دن اس کی حالت یک بیک متغیر ہو گئی۔ اور تیسرے دن شام کو وہ بھی مر گئی۔

سلیمہ کے سسرال میں اتنی خوشی کے بعد یہ پہلا المناک سانحہ تھا۔ تمام گھر میں کہرام مچ گیا۔ سلیمہ کی ساس کو خبر سنتے ہی غش آ گیا۔ ایک طرف میت گھر سے نکل رہی تھی۔ دوسری طرف اس کی ساس جاں بلب تھی۔ بسرعت تمام ڈاکٹر بلایا گیا متعدد ٹیکے لگے۔ کہیں چار گھنٹے کے بعد اس کو ہوش آیا۔ وہ یکایک بہت بوڑھی دکھائی دینے لگی۔

اس کے بعد اس کی ساس عموماً خموش رہتی۔ جب کبھی سلیمہ اس کے پاس بیٹھتی تو نامعلوم کیوں وہ ایسا محسوس کرتی گویا وہ کسی غیر کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔

کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ چند روز بعد اس کا باپ نمونیہ میں مبتلا ہو گیا۔ سلیمہ گھبراہٹ کے عالم میں گھر پہنچی۔ اس کا باپ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اور اس کی ماں اس کی پائنتی بیٹھی پنکھا کر رہی تھی۔ وہ والہانہ باپ سے لپٹ گئی۔ اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ تین دن تک وہ باپ کے سرہانے بیٹھی پنکھا کرتی رہی۔ نہ جانے کیوں اب وہ اپنے باپ سے زیادہ محبت محسوس کرنے لگی تھی۔ کنوارپنے میں اس کو کبھی ایسا احساس نہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا باپ بیمار پڑا تھا۔ لیکن وہ چولھے کے پاس بیٹھی رہتی۔ کبھی اماں آواز دیتیں۔ یا کوئی اور ایسی ضرورت ہوتی تو وہ باپ کے پاس جاتی۔ لیکن اب وہ اس کو کامل صحت میں دیکھنے کیلئے بے چین ہو رہی تھی۔

ساتویں روز اس کے باپ کی طبیعت سنبھلی اور اس نے سلیمہ کو سسرال جانے کے لئے کہا۔ سلیمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ہاں بیٹیا" اس کے باپ نے کہا "وہی تمہارا اصلی گھر ہے۔"

جب وہ اپنے سسرال آئی۔ تو اس کی ساس صحن میں بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ سلیمہ نے داخل ہوتے ہی سلام کیا۔ اس کی ساس نے آنکھ اٹھا کر اس کی

طرف دیکھا اور آہستہ سے جواب دیا اور اپنا کام کرتی رہی۔ سلیمہ بے دھیان اندر چلی گئی اور برقعہ اتار کر اپنی ساس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی: "لائیے خالہ جان میں آلو چھیل دوں۔" لیکن اس کی ساس نے کہا: "نہیں رہنے دو۔"

سلیمہ نے محسوس کیا اس کی آواز میں اِک دبی ہوئی چنگاری تھی۔ وہ اُٹھ کر رسوئی میں آگئی اور ہنڈیا دھونے لگی۔ پھر اس نے چولھے میں آگ جلائی اور کہا۔ خالہ جان ہنڈیا آگ پر چڑھا دوں؟" اس کی خالہ بولی: "رہنے دو آج میں خود ہی پکاؤں گی۔"

سلیمہ اُٹھ کر اس کے پاس آگئی: "کیوں خالہ جان۔ آپ کیوں پکائیں۔ میں پکاؤں گی۔"

"نہیں میں خود پکاؤں گی۔" اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ اور وہ بدستور سر جھکائے آلو چھیل رہی تھی۔

سلیمہ نے اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے سر نہ اُٹھایا۔ یہ دیکھ کر سلیمہ اپنی جٹھانی کے پاس آئی اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ اپنی گرم چادر پہ لیس لگا رہی تھی۔

"کب آئی ہو؟" وہ ٹانکے لگاتی ہوئی بولی۔

"ابھی آئی ہوں۔" سلیمہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی صرف کلاک کی متواتر ٹِک ٹِک سنائی دے رہی تھی۔ سلیمہ نے ذرا قریب ہو کر پوچھا۔

"آپا جان، یہ خالہ جان آج کچھ گھٹی گھٹی بیٹھی ہیں؟"

اس کی جیٹھانی نے دانتوں سے دھاگا توڑا، اور اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی

"یہ کیا، ابھی دیکھو گی۔"

"لیکن آخر میرا قصور کیا ہے؟"

"بس خالہ جان ہی سے پوچھو۔"

کچھ دیر کے بعد سلیمہ پھر رسوئی میں آئی اور چولہے کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کی ساس ہنڈیا میں ڈوئی پھیر رہی تھی۔ سلیمہ چپ بیٹھی رہی۔ اس کی ساس کو گھی کے ڈبے کی ضرورت پڑی، وہ اُٹھنے لگی تو سلیمہ جھٹ سے اُٹھی اور ڈبہ لا دیا۔ اس کی ساس نے لے لیا اور چپ رہی۔ پھر پانی کی ضرورت پڑی تو وہ خود اُٹھی۔ سلیمہ نے کہا، "خالہ جان میں لائے دیتی ہوں۔" لیکن اُس کی ساس نے خلاف معمول بڑا عجیب فقرہ کہا، "بیٹی تمہیں ناحق تکلیف دینا نہیں چاہتی۔" یہ سُنتے ہی سلیمہ گویا اپنی پیڑھی کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔

اس کی ساس آہستہ آہستہ بھاری قدم اٹھاتی ہوئی اِدھر اُدھر چیزیں اٹھا کر دھر رہی تھی۔ سلیمہ چپ بیٹھی آگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہنڈیا پک گئی تو اس نے توا رکھا۔ اس کی ساس جھپ جھپ روٹیاں توے پر لگا رہی تھی اور اتار رہی تھی۔ جب بیٹھے بیٹھے سلیمہ تھک گئی تو اس نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا اور اپنے آنچل سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ پھر اس نے اپنا جی کڑا کر کے پوچھا، "خالہ جان مجھ سے

کیا تقصیر ہوئی ؟"

اس کی ساس کے موٹے موٹے گال پھول گئے۔ اس نے غصّے سے آٹے کے پیڑے کو ہاتھوں پر پھیلایا اور توے پر دے مارا۔ "بی تمہاری تقصیر کیسا تقصیر تو ہماری ہے !"

"خالہ جان ! آخر کچھ مجھے بھی معلوم ہو۔"

لیکن وہ چپ رہی۔ اس نے روٹیاں پکا لیں۔ اور کھانا تقسیم کرنے لگی گھر کے تمام بچّے اکٹھے ہو گئے۔ اس کی جیٹھانی بھی آ گئی۔ تمام پیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کی ساس کٹوروں میں سالن ڈالتی جاتی اور ہر ایک کو دیتی جاتی۔ بچّے شور مچانے لگے۔ "بڑی اماں جان ہمیں وہ آلو ملنے چاہئیں۔" لیکن بڑی اماں جان نے سب کو گھُرک دیا۔ باورچی خانے میں اک خاموشی سی چھا گئی۔ صرف کھانے والوں کی چپڑ چپڑ سنائی دے رہی تھی۔ سلیمہ کے سامنے کھانا رکھا ہُوا تھا۔ لیکن اُس نے ایک لقمہ نہ توڑا۔ اس کی ساس چپ چاپ کھاتی رہی۔ کبھی کبھی وہ اس کی طرف ایک قہر آلود نگاہ ڈال لیتی۔ اور پھر کھانے میں مشغول ہو جاتی۔ آخر بڑی دیر کے بعد وہ بولی۔ "کھانا ضائع کیوں کر رہی ہو ؟"

سلیمہ نے آنچل سے آنکھیں پونچھیں اور کہا۔ "جب میں نے کام نہیں کیا تو کھانا کھانے کی مستحق کیونکر ہوئی ؟"

"اچھا تو گویا تم اُجرت پہ یہاں کام کر رہی ہو۔"

سلیمہ نے اپنے ہونٹ چبائے ضبط کے باوجود اس کی سسکیاں رک نہ سکیں۔ اس کی سسکیوں کی آواز بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ بچّے خرگوشوں کی طرح آنکھیں اٹھا کر اپنی چچی کو دیکھ رہے تھے۔ اور اس کی جیٹھانی آہستہ آہستہ ہڈی چچوڑ رہی تھی۔

"خدا کے لئے بین ہمارے گھر میں نہ کرو۔" اس کی ساس نے کرخت لہجہ میں کہا۔

"لیکن خالہ جان آخر میرا قصور کیا ہے؟"

"قصور مجھے معلوم نہیں تم ہی جانو۔ اگر میکے ایسے پیارے تھے تو وہاں سے آتی ہی نہ۔ بیاہ نہ کراتی، کچھ معلوم تھا تمہیں کہ تمہارا خصم کس تکلیف میں ہوگا گھر سے ایک دن کے لئے گئی اور پورے سات روز کے بعد آئی۔ گھر کی بہو بیٹیوں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے کیا؟"

"لیکن خالہ جان، ابا جان بیمار تھے۔"

"بیمار تھے! جانتی ہوں ان کی بیماری کو۔"

سلیمہ اس کے بعد کچھ نہ سن سکی۔ وہ برتنوں، دیگچیوں اور پیڑھیوں کو پھلانگتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ معلوم نہیں وہ کتنی دیر تک روتی رہی۔ جب اپنی آنکھوں سے دوپٹہ ہٹایا تو کھڑکیوں کے رنگدار شیشے زرد روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ اور سائے لمبے ہو رہے تھے۔ باہر سے طوطوں کی ٹیں ٹیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جو بجلی کے تاروں پر بیٹھے جھول رہے تھے۔ اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد اٹھنے

لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کی ناک بند ہو گئی۔ اور کنپٹیوں سے آگ کی لپٹیں اُٹھنے لگیں۔

۴

پانچ بجے کے قریب اُس کی محبوب کھٹ کھٹ سنائی دی ہمعید کے مضبوط قدموں کی دھمک اب زینوں پر سنائی دے رہی تھی۔ پھر اُسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور کچھ دیر کے بعد ہلکی ہلکی سیٹی بجنے لگی۔ جیسے صبح کی ہوا پھولوں میں سے گذر رہی ہو۔ اس کا جسم اُٹھنا چاہتا تھا لیکن وہ بیٹھی رہی۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ جہاں مکانات ایک خوبصورت نظم کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ اور فضا میں کبوتر کلیلیں کر رہے تھے۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس نے اپنے خاوند کے قدموں کی آہٹ اپنے قریب سنی۔ اُس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ روشنی میں چمک رہا تھا۔ اور اس کے خوبصورت بالوں میں سنہری لہروں کا مدوجزر پیدا ہو رہا تھا۔

"کیوں آج کیا بات ہے؟ ہم انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔"

وہ بھی عجیب قسم کا مسخرا تھا۔ سلیمہ نے دوپٹے کا آنچل اپنے منہ میں لے لیا۔ کہیں ہنسی کھسک نہ جائے۔ وہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"اچھا آج کیا نیا کام ہو گیا ہے؟ یہ ایسی خطرناک بیماری ہے کہ اس کا کوئی حتمی علاج دریافت ہی نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ بیسویں صدی کی سب سے زیادہ مہلک بیماری ہے۔"

پھر وہ کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ باہر طوطے بجلی کے تاروں پر جھول رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے قریب آیا اور کہا۔ "زکام میں خاموشی نہایت مفید ہے" یہ کہہ کر وہ اپنی بھاوج کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

رات کے وقت جب سعید اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور کمرے کے عین وسط میں فانوس جل رہا تھا تو سلیمہ دروازے کے پٹ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ سعید نے اس کی طرف مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں فانوس روشن تھا۔ "اب کیا افاقہ ہے؟"

سلیمہ نے دروازے کو چٹخنی لگا دی اور پلنگ کے قریب آ گئی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "کب آپ نے میرے ہاتھوں اذیت اٹھائی؟ اور کب میں نے آپ کی نافرمانی کی ہے؟ اگر آپ کو میرے جانے کے بعد کوئی تکلیف ہوئی تو آپ نے مجھے کیوں نہ بلا بھیجا؟ مجھ بیچاری کو تنگ کر کے آپ کو کیا ملے گا؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ اس کی سیاہ پلکیں بھیگ گئی تھیں جیسے بارش بند ہو جانے کے بعد اور بادل کھُل جانے کے بعد پھولوں کی ڈالیاں بھیگ جائیں اور ان کی پنکھڑیوں اور پتوں پر پانی کے موتی تھرتھرا رہے ہوں۔

کھڑکی کے باہر پیپل کے پتوں میں ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ اور بازار

میں گھوڑوں کی گھنٹیاں ایک جھنکار کے ساتھ بجنے لگیں۔

سعید کھلکھلا کر ہنس پڑا "آہ بچاری ابھاگن! تقصیر معاف"۔

لیکن سلیمہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکے اور رخساروں پر سے پھسلتے ہوئے اس کے دوپٹے میں الجھ گئے۔

دوسرے دن اس کی ساس کا پارہ اتر گیا۔ سعید نے اپنی خوش گپیوں سے سلیمہ اور اپنی ماں دونوں کو ہنسا دیا۔ اور دوپہر کا کھانا سلیمہ ہی نے پکایا۔

اس کے بعد معاملہ کچھ دنوں تک ٹھیک رہا۔ اور گھر کا کام خوش اسلوبی سے چلتا گیا۔ ساس بہو کی جھڑپیں کبھی کبھار ضرور ہو جاتیں۔ ساس پہلے سے زیادہ تیز تھی۔ لیکن سلیمہ بھی اب بے باک ہو گئی۔ شاید دونوں اس معاملے کی عادی ہوتی جا رہی تھیں بعض وقت کشیدگی کو ختم ہونے میں چند گھنٹے لگتے۔ لیکن بعض وقت کئی دنوں تک جھگڑا ناراضی اور خاموشی جاری رہتی۔ اس کی جیٹھانی بڑی خود پرست واقع ہوئی تھی۔ وہ اندھے فقیر کی طرح صرف اپنے روپوں سے غرض رکھتی تھی۔ وہ ان معاملات میں کم دخل دیتی۔ چنانچہ ساس بھی اس کے پاس جا کر دل کی بھڑاس نکال لیتی اور بہو بھی، وہ دونوں کی باتیں سنتی اور دونوں کے عیوب ایک دوسرے کے سامنے بیان کر دیتی۔ اور اس کا آخری فقرہ ہمیشہ یہ ہوتا "بہن میں تو سچی بات کہوں گی خواہ کوئی کتنا ہی برا مانے"۔

سعید بھی ایسی ہی بے تعلقی ظاہر کرتا۔ کئی بار وہ ثالث بنا اور صلح کرائی۔

اور کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ وہ سلیمہ سے ناراض ہوگیا تاہم حالات، جذبات کی بلندی پستی سے گذرتے گئے۔ اور آخر کار ایک ایسا معاملہ سامنے آگیا جس کی وجہ سے تمام افراد خاندان کو سر جوڑ کر بیٹھنا پڑا۔ اور وہ رضیہ کی شادی تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر کی مجلس شوریٰ بیٹھتی اور خرچ کے تخمینے لگائے جاتے۔ بیاہ کی تیاری باقاعدہ شروع ہوگئی۔ تمام عورتیں صحن میں بیٹھ کر کپڑے سیتیں اور دوپٹوں پر گوٹا کناری ٹانکتی رہتیں۔ صبح سے لیکر شام تک سینے والی مشین کی گھر گھر گھر میں گونجتی رہتی۔ شام کے وقت کہیں فارغ ہوتیں تو اگلے روز کے کام کی فکر شروع ہو جاتی۔

شادی کی تاریخ بھی نزدیک آن پہنچی۔ گلی میں چولھے لگ گئے۔ اور دیگوں کی کھڑک گونجنے لگی۔ ڈھولک کے گیت سنگت کے ساتھ گائے جانے لگے۔ لڑکیاں ایک گھڑا لے کر بیٹھ جاتیں۔ ایک لڑکی سلیپر کو گھڑے کے منہ پر مارتی تو اس سے گھٹے ہوئے ڈھول کی سی بھاری آواز نکلتی۔ دوسری ایک ٹھیکری سے گھڑا بجاتی جاتی اور تمام لڑکیاں ہم آہنگ ہو کر گانے لگتیں۔ رات کے وقت جب گیتوں کی مستانی آواز بلند ہوتی تو سلیمہ کے دن بھر کے تھکے پاؤں ہلکے پھلکے ہو جاتے۔ وہ چلتے چلتے رک جاتی اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتی تو ستارے گنگناتے معلوم ہوتے۔ اس کا دل ایک ہلکی سی دھڑکن سے دکھنے لگتا اور وہ ہمیشہ سوچتی اس راگ میں کیا جادو ہے۔ یہ ماں باپ کی جدائی کے گیت! یہ روح و جسم کا معاملہ! شادی بھی موت سے

کتنی مشابہ ہے۔ اس کی آنکھوں میں پانی سا تیرنے لگتا۔

رخصتی کے دوسرے دن سلیمہ کی زندگی میں، ہاں صرف سلیمہ کی زندگی میں ایک واقعہ پیش آیا۔ وہ اس راز کو کسی پہ ظاہر نہ کر سکتی تھی۔ دوسرے لوگ شادی کے خوش انجام پر مسرور تھے۔ اس کی ساس تو اس طرح خوش خوش کام کرتی پھر رہی تھی گویا منوں کا بوجھ اس کے سر سے اُتر گیا ہے۔ لڑکیاں واقعی بوجھ ہوتی ہیں پھر اچھے بر کا ملنا تو فی زمانہ امرِ محال ہو رہا ہے۔

دوسرے روز رات کے وقت جب وہ سارے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ سعید ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور کروشیا سے رومال کاڑھنے لگی۔ دیر تک وہ کروشیا کاڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ گھوڑوں کی گھنٹیاں بھی بند ہو گئیں اور پیپل کے پتوں کے پیچھے تارے ٹوٹنے لگے۔ دُور شہر کے گھنٹہ گھر نے نصف شب گزر جانے کی خبر دی۔

"یا اللہ، یہ کیا، وہ ابھی تک نہیں آئے۔" سلیمہ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کارنس پر رکھی ہوئی گھڑی کی دونوں سوئیاں اس طرح جدا ہو رہی تھیں۔ جس طرح آج اور کل۔ اس نے اُٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سیاہی اور سکوت چھائے ہوئے تھے۔ وہ برآمدے میں آئی۔ گھر کے تمام افراد سو چکے تھے۔ تہ دری میں لمپ کی مدھم لَو سے زرد تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر چھجے پر کھڑی تاروں کو دیکھتی رہی پھر تھک کر کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ مگر نیند کہاں۔ اس کے دماغ میں ایک ہی

خیال چکر لگا رہا تھا "وہ کہاں گئے۔"

جب گھڑی کی منٹوں والی سوئی بارہ سے چار قدم دور تھی تو نچلے برآمدے میں قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی لیکن وہ کھٹ کھٹ مستعد اور مضبوط نہ تھی بلکہ لڑکھڑائی ہوئی اور ناہموار کبھی قدم چلتے اور کبھی رک جاتے۔ پھر سکوت طاری ہو جاتا اور اس کے اندر سے ہلکی سی سیٹی کی بجائے بڑی بڑی ہچکیوں کی آواز آتی۔ بڑی آہستگی سے وہ قدم دروازے کے قریب پہنچے، اور پھر مدھم سے دروازے کے پٹ کھلے اور وہ دروازے کی دہلیز میں کھڑا تھا۔ اس کے گلے میں گیندے کا مسلا ہوا ہار تھا۔ اس کے بال پریشان ہو رہے تھے۔ اور اس کی دو خوبصورت لٹیں کھسک کر پیشانی پر آرہی تھیں۔ وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ اور سلیمہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہری سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ سلیمہ جلدی سے اٹھی اور اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس میں عیّاری اور شیطنت جھلک رہی تھیں

"اندر آجائیے" سلیمہ نے کہا۔

وہ دیوار کا سہارا لیتا ہوا پلنگ تک پہنچ گیا۔ دو بار اس کے قدم ڈگمگائے اور وہ گرتے گرتے بچا۔ سلیمہ نے جلدی سے دروازے کو چٹخنی چڑھا دی۔

وہ بغیر کوٹ اتارے پلنگ پر گر گیا۔ اس کا سر تکئے پر لگا ہوا تھا۔ اور وہ فانوس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس کی روشنی کچھ سوتی دکھائی دے رہی تھی۔ سلیمہ پلنگ کی پٹی کے

قریب کھڑی ہوگئی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "یہ آپ نے کیا کیا؟"

وہ گیدڑ کی طرح مسکرا رہا تھا۔ سلیمہ کی آنکھوں میں ایک دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ اس کے اوپر جھک کر اس نے مسلے ہوئے گجرے کے ہار کو توڑ دیا۔ جونہی وہ اس کے قریب ہوئی۔ ایک عجیب قسم کی گرم گرم بُو اس کے منہ سے اس کی طرف لپکی۔

اس نے تیزی سے پوچھا: "یہ آپ نے کیا کیا؟" اس کی آواز میں آنسو اور چیخ دونوں تھے۔

لیکن اس نے گویا سنا ہی نہیں۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور خراٹے لینے لگا۔ وہ پہلے چپ بیٹھی رہی پھر اُس نے سوچا کوئی اندر آجائے اور اسے اس حالت میں دیکھ لے تو کیا سمجھے۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھی اور اس کے بوٹ اتارے۔ پھر اس کا کوٹ اُتارا اور اس پر کمبل ڈال دیا۔ سعید نے اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ لیے اور خوب آرام سے سو گیا۔

صبح کے قریب سعید نے اپنی آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ سلیمہ اس کے سرہانے بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

"سلیمہ!" سعید نے انگڑائی لیتے ہوئے پکارا۔

سلیمہ چونک پڑی۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو وہ بے خوابی اور کسی نامعلوم وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا چہرہ موسم سرما کی دوپہر میں ٹھٹھر کر نچڑ ا لیے

راہی کی طرح اُترا ہوا تھا۔ سعید نے محسوس کیا گویا سلیمہ کی آنکھیں جذبات سے یک بیک خالی ہو گئی تھیں۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔

سعید نے کہا "سلیمہ! ناراض ہو گئی۔ یونہی رات مجھ سے غلطی ہو گئی"۔

سلیمہ پھر بھی نہ بولی تو سعید نے کہا "مجھے معاف کر دو"۔

جواب کی بجائے سلیمہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کر کے آنسو گرنے لگے۔

اب گھر میں ہر طرف کھٹ کھٹ اور بچوں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ اس لئے سلیمہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سعید نے لجاجت سے کہا "خدا کے لئے اپنی صورت ٹھیک بنا لو۔ ذرا آئینہ دیکھو جیسے دھوپ میں کنول کمہلا جائے۔ میری سلیمہ میں تمہارے سامنے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی ایسا نہ کروں گا"۔

۵

اس واقعہ کے بعد سلیمہ کی زندگی واقعی ایک نئے دَور میں داخل ہو گئی۔ وہ لڑکی سے ایک عورت بن گئی۔ وہ گھر میں بیٹھتی۔ عورتوں کی باتیں سنتی۔ اور ان کی ایک ایک رگ سے واقف ہو گئی۔ اب وہ جان گئی کہ کن مواقع پر انسان کو ظاہر دار بننا چاہیئے کن مواقع پر اس کو جھک جانا چاہیئے۔ اور کن مواقع پر اسے چٹان بن جانا چاہیئے یہ صرف اس کی حالت نہ تھی بلکہ اس نے محسوس کیا کہ رضیہ کی شادی کے بعد اس کا تمام سسرال ہی ایک نئے دور میں سے گزر رہا تھا۔ رضیہ کی شادی کے لئے انہیں اپنا ایک مکان (ان کی فقط یہی جائداد) بھی فروخت کر دینا پڑا۔ اس کے

سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ گھروں کی لاج رکھنا بھی آخر انسانی غیرت ہے۔ لڑکی کو جہیز نہ دیا جائے تو پھر لڑکے لڑکی کے لئے ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھنے کیلئے کونسی تدبیر اختیار کی جائے؟ کہنے کو تو ہر ایک کہہ دیتا ہے بھائی فضول خرچی مت کرو۔ لیکن اگر وہ کہنے والا لڑکی کا باپ ہو یا لڑکے کا باپ تو یقیناً وہ لینے میں بھی فیاضی کی توقع کرے گا۔ اور دینے میں تو آخر اس کی عزت کا سوال ہے ہی۔ لیکن اس کے علاوہ ان کے گھر کی دوسری پونجی بھی اس کی نذر ہو گئی۔ صرف برات کی ضیافت پہ پورا دو ہزار روپیہ خرچ اٹھا۔ ذرا اندازہ کیجئے۔ گھر کے باہر ایک خیمہ نصب تھا۔ جس میں قطار در قطار میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور ان کے اوپر کوئی دو سو آدمی کھانا کھا رہا ہے۔ گھر اندر عورتیں بھی دو سو سے کم نہ تھیں۔ اگر فی عورت ایک بچہ بھی لگایا جائے تو کل تعداد چار سو بن جاتی ہے۔ دراصل تعداد اس سے زیادہ تھی۔ کیونکہ حقیقت خیال سے کچھ مختلف ہی ہوتی ہے۔

اب وہ دیکھ رہی تھی کہ گھر کا ایک ایک فرد پیسے کی تنگی کی وجہ سے ایک دوسرے کو گھور رہا تھا۔ کھانا کھانے کے وقت اس کی ساس بچوں کو گھرکتی جھڑکتی، اگر کہیں آٹا گرا نظر آجاتا تو تمام گھر کی شامت آجاتی۔ پہلے بچوں کی قمیصوں کے لئے دس آنے گز والا کپڑا لیا جاتا۔ لیکن اب پانچ آنے گز والا کپڑا کافی تھا۔ اس کی جیٹھانی بالعموم اس کے پاس بیٹھے خرچ کی تنگی کا شکوہ کرتی رہتی۔

"بہن کیا کہوں۔ بچوں کی مصیبت بڑی ہوتی ہے۔ ہر مہینے یہی فکر ہوتی ہے

کہ اس کا پاجامہ پھٹ گیا۔ اس کی قمیص ادھڑ گئی ہے۔ وہ بیمار ہو گیا ہے۔ اُسے زکام ہو گیا ہے۔ اب بتاؤ کوئی کرے تو کیا کرے سو روپے کا نوٹ لے کر بازار میں چلے جاؤ بس اتنی چیزیں ملیں گی جو تمہاری جیب میں بخوبی سما سکیں۔ پھر آمدنیوں کا بھی تو وہ سلسلہ نہیں رہا۔"

"لیکن آپا جان! آخر ان بچوں ہی کے لئے تو سب کچھ کمایا جاتا ہے۔"

پھر وہ کہتی "بہن خوش قسمت ہو جو ابھی اس جھنجھٹ سے بچی ہوئی ہو۔"

لیکن ہمیشہ یہ سنتے ہی سلیمہ کے دل کے اندر سے ایک لو سی بھڑک اٹھتی۔ ایک تمنّا جو دھیمے دھیمے سلگ رہی ہے۔ اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوتی اور اس کی نس نس میں اک گدگدی سی ہونے لگتی۔ اس وقت وہ چاہتی کہ کوئی ایسی ننھّی منّی سی چیز اُس کے پاس ہوتی جس کو وہ اپنی چھاتی سے بھینچ لیتی۔

اس موسم سرما میں یکایک ایک صبح اُس نے محسوس کیا گویا وہ اپنی منزل کے قریب تھی۔ اس کے پپوٹے بھاری ہو گئے۔ اور اس کی آنکھوں میں معانی کی ایک کائنات سما گئی۔ وہ روز بروز زیادہ حساس ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہر بات کو فوراً بھانپ لیتی۔ اس کا رنگ نکھرتا جا رہا تھا۔ اور اس کی شخصیت میں ایک تحکم سا پیدا ہو گیا۔

کام کرتے کرتے اب وہ غیر معمولی طور پر تھک جاتی۔ تھکن کی لذت سے لبریز ہلکی ہلکی ٹیسیں اس کے جسم میں اُٹھنے لگتیں۔ وہ کام کرتے کرتے رک جاتی اور ہانپنے لگتی۔ اس کی ساس اب اس کو بھاری اور تھکا دینے والے کاموں سے ہٹائے

رکھتی۔ خود سلیمہ نے بھی محسوس کیا۔ جیسے اب اس کی سانس کے لہجے میں ایک مادرانہ جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھتی۔ گویا اس کے سر پر کانچ کا برتن رکھا ہوا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ برتن صاف کرتی اور آہستہ آہستہ کپڑے دھوتی۔

ایک دن وہ چھت پر کپڑے نچوڑ کر پھیلانے گئی تو اس نے دیکھا کہ سعید بڑی خاموشی سے لیٹا سگرٹ پی رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رُخ دیوار کی جانب تھا جب سلیمہ چھت پر آئی تو اس نے اُسے دیکھا۔ لیکن پھر اپنا منہ بدستور دیوار کی طرف کئے رکھا اور سگرٹ پیتا رہا۔ سلیمہ کپڑے پھیلا کر اُس کے قریب آگئی، اور کھڑی ہوگئی۔ "کیوں جی کیا بات ہے؟" اس نے اس کے چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑتے ہوئے اپنی طرف پھیرا۔ سعید پھیکا سا مسکرایا۔ اور خاموشی سے سگرٹ پیتا رہا۔

سلیمہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے اس کو اس راز سے آگاہ نہ کیا تھا۔ کچھ لمحات تک وہ سوچتی رہی کہ وہ اس خبر کو اس پر کیسے ظاہر کرے۔ وہ اس وقت ایک سرور سا محسوس کر رہی تھی۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ کوئی کلمہ منہ سے نکالتی اس کا دل ہلکا ہلکا کانپنے لگا۔

"میں آپ کو ایک خوش خبری سناؤں مجھے کیا ملے گا"

سعید کے چہرے پر کچھ رونق سی آگئی۔ اس نے اپنا انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا "یہ"

سلیمہ اس کے کان کے قریب اپنا منہ لے گئی۔ لیکن سعید کے چہرے کی پہلی

چمک بھی بجھ گئی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور اس کا سر ڈھلک گیا۔ بڑی آہستگی سے اُس نے کہا: "سلیمہ میں تمہارے جذبات کے نازک تاروں کو توڑنا نہیں چاہتا لیکن کیا تم اس معاملے کو ملتوی نہیں کر سکتیں؟"

سلیمہ یکایک کانپ اُٹھی۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اور حیرت سے اس کے لب نیم وا ہو گئے۔

سعید کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ "میری سلیمہ، ہم ابھی اس قابل نہیں کہ اس آنے والے بچے کا بوجھ اُٹھا سکیں۔ ابھی ہم پر مالی مشکلوں کے بہت دَور آنے والے ہیں، میں خوب سمجھتا ہوں ——"

سلیمہ چیخ اُٹھی: "خدا کے لئے ایسی ڈراؤنی باتیں مت کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ جس خدا نے مجھے اِس دُنیا کے اندر بھیجا ہے وہ مجھے روزی دے گا۔ ہاں وہ سب کو روزی دیتا ہے!"

"خدا ——" وہ پھر لیٹ گیا اور سگرٹ کے کش لگانے لگا۔

وہ سعید کی پریشانی کا پورا مطلب پندرہ دن بعد سمجھ سکی۔ اس دن بارہ بجے کا کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں آن لیٹی۔ کیونکہ اس کا سر کچھ گراں سا ہو رہا تھا چارپائی پر لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور اس وقت کھلی جب ظہر کا وقت ڈھل چکا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور غسلخانے میں وضو کرنے کے لئے گئی۔ جب وہ جیٹھانی کے کمرے کے قریب سے گزری تو اس نے دیکھا کہ کمرے کے

پٹ بھڑے ہوئے ہیں۔ اور اندر سے سعید، اس کے جیٹھ اور اس کی ساس کی غصّے سے گھٹی گھٹی آوازیں آ رہی تھیں۔

"ہاں بھائی تمہیں اپنے قدموں پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ اس میں کوئی رورعایت نہیں ہو سکتی"۔ اس کے جیٹھ کی آواز آ رہی تھی۔

سعید نے جواب دیا۔" اب آپ کو زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے خواہ ڈاکہ ڈالنا پڑے میں آپ پر حرف نہ آنے دوں گا"۔

وہ زیادہ دیر تک کھڑی رہ کر پورا معاملہ سمجھنا چاہتی تھی۔ لیکن صحن میں بچے اودھم مچا رہے تھے۔ اور اُسے ڈر ہوا کہیں وہ چوری سننے پکڑی نہ جائے۔ اِس لئے وہ جلدی سے غسلخانے میں چلی گئی۔

رات کے وقت سلیمہ سے پہلے سعید اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ چُپ چُپ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے پتّوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن کے پیچھے چوتھی کا باریک چاند چمک رہا تھا۔ بازار میں گھوڑوں کی گھنٹیاں ٹن ٹن کرتی ہوئی گذر رہی تھیں۔

سلیمہ نے سعید سے پوچھا۔" سچ سچ بتائیے آج کیا معاملہ تھا۔ میں آپ کو کئی دن سے کسی سوچ میں کھویا ہوا دیکھ رہی ہوں"۔

سعید مسکرایا اور کہنے لگا:" کچھ نہیں میری سلیمہ"۔

"نہیں مجھے بتائیے، آپ مجھ سے چھپاتے کیوں ہیں۔ کیا میں کوئی غیر ہوں بتائیے۔"

سعید ہنس پڑا "بس کوئی بات ہو تو بتاؤں"

سلیمہ نے سر جھکا لیا اور کہا "آہ مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھ کو دل سے اس قدر دور پھینک رکھا ہے۔ میں آپ کی زندگی کی شریک اس لئے بنی تھی۔ کہ آپ کے سفرِ حیات میں آپ کی خدمت کر سکوں۔ مگر آپ مجھے اتنا بھی مرتبہ نہیں دیتے" یہ کہتے ہوئے وہ کھڑکی کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

سعید کچھ دیر خاموشی سے سگرٹ کے کش لگاتا رہا۔ دھوئیں کے چکر فانوس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا "محض ایک خیال میرے ہونٹوں پر مہر لگا دیتا ہے وہ یہ کہ کہیں تمہارا دل نہ دکھ جائے۔ تم یہ تو جانتی ہو کہ رضیہ کی شادی ہمیں کس قدر مہنگی پڑی ہے۔ مکان کے علاوہ جو پونجی نقد تھی۔ وہ بھی صرف ہو گئی۔ اس پر ہمیں دو ہزار مزید قرض اٹھانا پڑا۔ جو غالباً تم سے بالکل پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اب ہم دونوں بھائیوں نے قرضے کو آدھا آدھا بانٹ لیا ہے، مجھے ایک ہزار ادا کرنا ہوگا۔ بس یہی بات تھی"

سلیمہ اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ سعید تکیہ پر سر رکھے فانوس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر رنج و فکر سے شکنیں پڑ گئی تھیں۔

"بس یہی بات تھی؟" سلیمہ نے کہا۔

"ہاں یہی بات تھی"

نہایت خاموشی سے سلیمہ نے اپنے ہاتھوں کی کنگنیاں اتار کر اس کے

سامنے رکھ دیں۔ پھر اُس نے اپنے کانٹے بھی اتار کر رکھ دیئے۔ اور کہنے لگی۔ "یہ سب چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ میرے دل کے مالک میں تمہاری باندی ہوں۔ اگر میرے جسم کو بیچ کر تمہیں سکھ ملتا ہے تو اس کے لئے بھی حاضر ہوں"۔

سعید چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ سلیمہ نے اپنے آنچل سے اس کے رخساروں کو پونچھ دیا۔ "آپ کیوں روتے ہیں۔ اس کام کے لئے میری آنکھیں کافی ہیں"۔

پیپل کے اوپر کوئی رات کا پرندہ کوک رہا تھا۔ اور چاند پتوں کے پیچھے چمک اُٹھا۔ باہر بازار میں ایک گھوڑے کی گھنٹی بجی اور اپنے پیچھے تھرتھراتی ہوئی خاموشی بکھیر گئی۔

۶

دو مہینے بعد وہ دردِ زہ میں جکڑی ہوئی بستر پر پڑی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ اور اپنے تکیہ پر سر ٹپک رہی تھی۔ آہ یہ کیا ہے کہ ہر لذت الم کے بطن سے نکلتی ہے۔ اور یہ انسان جو دُنیا میں آ کر یوں جنگیں لڑتا۔ اور شعر لکھتا ہے کس تکلیف سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا اس کی زندگی ایک رحم سے نکل کر دوسرے رحم تک جاتا ہے؟ لیکن یہ صحیح ہے، وہ پچھلے عالم سے اِس عالم میں درد و کرب میں چکر کھاتا ہوا آیا۔ اسی طرح جب وہ اِس عالم سے دوسرے عالم میں جائیگا۔

تو لحد کے رحم میں سے چکر کھاتا ہوا باہر نکلے گا۔ مادرِ گیتی ایک جلنے والی عورت کی طرح کرب سے کروٹیں بدلے گی اور چیخے گی۔

آخر اس نے رونا شروع کر دیا۔ جیسے بچے روتے ہیں۔ اس کی ماں بیکل ہو کر قرآن پڑھنے لگی۔ اس نے اس کے سر کو اپنے رانوں پر رکھ دیا۔ دائی ادویات تیار کر رہی تھی۔ وہ کمرے میں اس طرح کام کر رہی تھی گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ کبھی کبھار وہ اپنے کام سے سر اٹھا کر سلیمہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی اور کہتی "میرا بیس سالہ تجربہ بتاتا ہے کہ آج کی لڑکیوں کے سرین اس قدر کم چوڑے ہیں کہ مضبوط و سڈول بچوں کے رہنے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں رہی۔ اس کی وجہ؟ بس یہی کہ عورتیں مشقت کم کرتی ہیں۔ نئی سائنس اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس دوران میں ورزش اور مشقت نہ کی جائے لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ پچیس فی صدی بچے قبل از وقت پیدا ہو جاتے ہیں یا لڑکی کی حالت دیکھتے ہوئے ضرورت ہوتی ہے کہ قبل از وقت لوتھڑا نکال لیا جائے اور پچیس فی صدی بچے مردہ پیدا ہوتے ہیں۔ باقی پچاس فیصدی لاغر اور کمزور ہوتے ہیں۔"

اس نے سرنج کو سپرٹ سے مطہر کیا اور اس میں دوائی بھرتے ہوئے کہا "میں نے دیہاتی عورتیں دیکھی ہیں کہ دن کو کھیتوں میں دانے بکھیرتی رہتی ہیں اور رات کو تمام کنبے کو کھانا کھلا اور سلا کر بچہ جن دیا۔ اور صبح کو پھر خاوند کا کھانا لے کر کھیتوں کو چل دیں۔"

صبح چار بجے کے قریب بچہ پیدا ہوا۔ وہ لڑکا تھا۔ اُس نے دنیائے احساس میں چار گھنٹے تک سانس لیا اور مر گیا۔ سلیمہ گھبراہٹ اور بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ جب وہ بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر لے چلے تو اس نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کی ماں نے اس کے سامنے اس کا چہرہ کھول دیا۔ ضبط کے باوجود اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس کے خونِ جگر سے پلا ہوا ٹکڑا اب مٹی میں دبا دیا جائے گا؟ اسی کے لئے اس نے اتنا دکھ اور تکلیف برداشت کی تھی!

اس کے اردگرد کھڑی ہوئی عورتوں نے اپنے چہروں کو دوپٹوں میں لپیٹ لیا۔ اور رونے لگیں سلیمہ کا سر چکرانے لگا۔ اور وہ بستر میں گر گئی۔

دوسرے دن شام کے قریب اس نے سعید کے قدموں کی محبوب کھٹ کھٹ اپنے کمرے کے باہر سُنی۔ یکایک اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور اُس نے اپنا مُنہ چادر میں چھپا لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سعید زور سے کھانسا اور پھر اس کے قہقہہ لگا کر ہنسنے کی آواز آئی۔

"بس جی یہ گھونگٹ کھولو۔ میں آپ کے جرم کو معاف نہیں کر سکتا۔"

لجاتے ہوئے اس نے منہ سے کپڑا اٹھایا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز تبسم کھیل رہا تھا۔ اس نے پھر کہا "یہ تم نے کیا کیا۔" اس پر سلیمہ پھر رونے لگی۔

"بس جی چھوڑو ایسی باتیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ مجھے تو صرف تمہاری

زندگی چاہیئے۔"

اس رات دو بجے کے قریب سلیمہ کی گردن کے پٹھے کھنچنے شروع ہو گئے وہ گھبرا کر بستر میں بیٹھ گئی لیکن تناؤ شدید سے شدید تر ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی ساس کو آواز دی وہ جلدی سے اُٹھی اور بجلی روشن کی۔ سلیمہ بے طرح سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ اس کی ساس کے دیکھتے دیکھتے سلیمہ کی انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں اور اس کے گلے میں غرغراہٹ سی پیدا ہو گئی۔ وہ چلانے کی کوشش کرتی تھی لیکن یوں معلوم ہوتا تھا گویا اس کے جبڑوں کو تالا لگ گیا ہے۔

اس کی ساس نے جلدی سے اپنے بیٹے کو جگایا۔ اور اُسے ڈاکٹر کی طرف دوڑایا۔ اس کی جیٹھانی بھی بیدار ہو گئی۔ اس کی ساس نے جلدی سے گرم تیل کی مالش شروع کر دی۔ لیکن درد اس کے جسم کو اس طرح موڑ توڑ رہا تھا جس طرح کپڑے کو نچوڑنے کے لیے مروڑا جاتا ہے۔ آدھ گھنٹے میں ڈاکٹر بھی پہنچ گیا سلیمہ کی حالت دیکھ کر اس کا چہرہ اتر گیا۔ لیکن اُس نے جلدی سے بکس کھولا۔ اور مارفیا کے دو انجکشن لگا دیئے پندرہ منٹوں میں وہ اطمینان سے سو گئی۔

ڈاکٹر باہر نکلا اور سعید کو بتایا کہ یہ مرض ٹیٹنس ہے جو غالباً کسی خراش یا زخم کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے تمام جسم میں زہر پھیل گیا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک دوائی کا نام لکھ دیا جس کے ٹیکے اس مرض کا واحد علاج تھے۔ اگر وہ دوا بھی مؤثر ثابت نہ ہوئی تو سلیمہ باقی نہ رہے گی۔ یہ سنتے ہی سعید

کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ اسی وقت بھاگا اور دواؤں کا روا قعت کار دوافروشوں کے گھر جا کر ان کو جگایا۔ اور ان کی منت سماجت کی اور دوگنی قیمت دے کر ان سے ٹیکے لیے۔

اب پو پھٹ رہی تھی اور سلیمہ کی آنکھ پھر کھل گئی۔ درد پھر شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر کرسی لے کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اس نے ٹیکے لگانے شروع کر دئیے۔ چار گھنٹوں کے بعد وہ زندگی کی طرف واپس آ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے ماتھے پر پسینے کے دھارے چھوٹ رہے تھے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے سعید کی طرف دیکھا اور کہا "میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں" جب ڈاکٹر چلا گیا۔ تو سعید سیدھا اپنے کمرے میں آیا اور تکیہ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جب سلیمہ بستر علالت سے اٹھی تو وہ اس قدر ناتوان ہو چکی تھی کہ اس سے دو قدم بھی نہ چلا جاتا تھا۔ اس کی ساس نے دو دیگیں چاولوں کی پکوائیں۔ اور غربا میں تقسیم کیں اس کی ماں نے تمام مسجدوں میں پیسے تقسیم کئے۔ اور شکرانے کے نفل ادا کئے۔

اب سعید اپنا سارا وقت سلیمہ کے پاس ہی گزارتا۔ سلیمہ اور سعید میں دوا پینے پر کئی ایک جھڑپیں ہو گئیں۔ سعید اصرار کرتا کہ دوا پیو۔ لیکن سلیمہ ناک چڑھا لیتی۔ بالآخر اسے زبردستی دوا اس کے منہ میں انڈیلنی پڑتی۔ جب وہ مکمل صحت مند ہو گئی تو ایک دن سعید نے اسے باتوں باتوں میں بتایا۔

"سلیمہ اگر تم مر جاتی تو میں ضرور خودکشی کر لیتا"۔

سلیمہ ہنس دی۔ اور اُس نے منہ چڑا کر کہا "میں مردوں کو خوب سمجھتی ہوں پہلی بیوی کے چالیسویں پر ہی دوسری شادی کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں"۔

وہ مسکرا دیا۔ لیکن وہ سلیمہ پر جتانا نہ چاہتا تھا کہ اس کی علالت نے اُس پر کتنا زبردست اثر چھوڑا تھا۔ وہ واقعی پہلے سے زیادہ متین اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ دفتر سے آتا۔ چائے کی پیالی پی کر اپنی فائلیں کھول لیتا۔ اور شام کے کھانے تک کام کرتا رہتا۔ پھر کھانا کھانے کے فوراً بعد بیٹھ جاتا اور نصف شب تک کام کرتا اور سگرٹ کا دھواں چھوڑتا رہتا حتیٰ کہ کمرے میں دھوئیں کی پتلی سی دھند چھا جاتی۔ اور راکھ دانی سگرٹ کے ٹکڑوں اور راکھ سے لبالب بھر جاتی۔

اس کثرت کار کی وجہ سے اکثر زکام ہو جاتا۔ سلیمہ بسا اوقات تنگ آ کر بتی گل کر دیتی اور اُس کے منہ پر زبردستی چادر اوڑھا دیتی۔ لیکن کثرتِ کار اس پر اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہی۔ ایک رات کا ذکر ہے وہ کام کر کے سویا تو صبح اس سے اُٹھا نہ گیا۔ اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی اور آنکھیں سُرخ۔ سلیمہ نے جو ماتھے پر ہاتھ رکھا تو وہ پھک رہا تھا۔

"میں نہ کہتی تھی کہ اپنا سر اتنا مت کھپایئے"۔ سلیمہ نے پیار سے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"لیکن سلیمہ اگر کام نہ کروں تو کیا کروں۔ تم خود ہی دیکھ لو کہ تمہارے زیور سے

بہن کا فرض ادا ہوا۔ لیکن تمہاری بیماری پر جو لگا وہ بھی تو آخر ادا کرنا ہے۔"

"وہ میں خود ادا کرلوں گی۔ آپ اتنی فکر کیوں کرتے ہیں۔"

دوپہر کے قریب اس کا ٹمپریچر ۱۰۳ تک پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر آیا اور اس نے دیکھ بھال کے تسلی دی اور دوائی بھیج دی۔ لیکن بخار گھٹنے کی بجائے اور تیز ہوگیا۔ شام کی نماز سے فارغ ہوکر سلیمہ نے تھرمامیٹر لگایا تو پارہ ۱۰۵ ڈگری پر پہنچا ہوا تھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور پٹیاں ٹھنڈے پانی میں ترکر کے ماتھے پر رکھنے لگی۔ بخار کی تیزی میں وہ ہذیان بکنے لگا۔ اس نے اپنے اوپر سے چادر اتار پھینکی اور زور زور سے بولنے لگا اس کی ماں نے اس کے سر کو اپنی گود میں لے لیا۔ اور آہستہ آہستہ دم پڑھ کر پھونکنے لگی۔ سلیمہ روتی جاتی اور پٹیاں پانی میں بھگو کر اس کے ماتھے پر رکھتی جاتی۔ رات کے دو بجے کے قریب اس کا بخار اترا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اس کا بخار کافی اترا ہوا تھا۔

دن چڑھے جب سلیمہ باورچی خانے سے بچوں کو کھانا کھلا اور سکول رخصت کر کے فارغ ہوکر آئی تو سعید بستر میں تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ سلیمہ اس کے قریب پہلو میں بیٹھ گئی۔ کھڑکیوں کے پردوں میں سے روشنی چھن چھن کر اندر فرش پر لوٹ رہی تھی اور پیپل کے سبز پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑا رہے تھے۔

"سلیمہ" سعید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں دیکھ کر ہمیشہ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں کتنا برا ہوں۔"

سلیمہ مسکرائی، سعید کے چہرے سے سُرخی غائب تھی۔ اور اس کا رنگ نچڑے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک گہری آہ بھری اور کہا "سلیمہ میں آج تم سے ایک راز کہتا ہوں۔ مَیں نے اس سے پہلے کبھی خدا کو نہیں مانا تھا لیکن آج میں اس کے نور کا ہلکا سا احساس اپنے دل میں خراش پذیر پاتا ہوں۔ مَیں ہمیشہ سوچتا تھا۔ یہ پیغمبر کیوں ہر بات سے پہلے خدا کو منواتے ہیں؟ ہمیں خدا پر کیوں ایمان لانا چاہیئے؟ کیا ہم اِس عقیدے کے بغیر بھی زندگی میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ آج مجھے اِن سوالوں کا جواب مل گیا ہے۔"

"وہ کیا؟" سلیمہ نے پوچھا۔

"یہی کہ خدا کو مانے بغیر ہمارا کوئی عمل صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر آج دنیا خدا کے عقیدے سے دست بردار ہو جائے تو کل تمام اِنسان ایک دوسرے کا گلا کاٹ کر مٹ جائیں۔ خدا کے تصوّر کا یہی نور ہے جو ہمارے دلوں کو روشن کر رہا ہے۔ کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور بدلہ لینے کے وقت رحم کرتے ہیں بیشک اِسی سے چشمۂ حیات میں مدوجزر پیدا ہو رہا ہے سلیمہ، آج مجھے خدا نظر آ رہا ہے۔"

اِس نئے احساس سے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک سی پیدا ہو رہی تھی۔ کھڑکیوں کے پردے ہوا سے ہلنے لگے۔ اور پیپل کے پتے کھڑکھڑانے لگے۔ درخت کی کسی ڈالی پر بیٹھی ہوئی کوئل زور زور سے کوکنے لگی۔ کمرے میں ایک نئی روشنی ہو گئی۔

"سلیمہ تم ہی نے مجھے راہِ راست پر لگایا بیسویں صدی کے عقل زدہ جوان کے لئے قدیم ہاتھوں کی پروردہ ایک بھولی بھالی لڑکی ہی مشعل راہ ہو سکتی ہے"۔

شام کے وقت اس کا بخار بالکل اتر چکا تھا صرف نقاہت باقی تھی۔ تاہم اُس نے ذرا ٹہلنے کی خواہش ظاہر کی۔ سلیمہ اُسے سہارا دے کر چھت پر لے گئی۔ جہاں وہ اسے اپنے کندھے کا سہارا دئے کر اِدھر اُدھر سیر کراتی رہی۔

دوسرے دِن اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ اور وہ سلیمہ کے منع کرنے کے باوجود تولیہ لے کر غسلخانے میں گھس گیا۔ جب وہ اس کے کپڑے دراز میں سے نکال رہی تھی۔ تو غسلخانے کے اندر سے ہلکی پھلکی سیٹی بجنے لگی۔ جیسے صبح کی ہوا پھولوں میں سے گزر رہی ہو۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پیپل کے پتے تال بجا رہے تھے اور بازار میں گھوڑوں کی گھنٹیاں ٹن ٹن کرتی ہوئی بج رہی تھیں ؎

غلطی کا احساس

آدھی رات کے وقت جب کل کائنات سکوت اور سیاہی میں ڈوبی ہوتی ہے تو زمین کا سینہ ابھرتا ہے اور وہ اپنے بازو پھیلا دیتی ہے اور پکارتی ہے "اے میرے محبوب آ۔ آ اور میرے سینے سے لگ جا۔"

ستارے ڈھلکتے ہیں شبنم آہستہ آہستہ آسمانوں سے اُترتی ہے اور زمین سے بغلگیر ہو جاتی ہے، زمین آہستہ آہستہ جھولتی ہے اور شبنم اس کے سینے پر سر رکھ کر سو جاتی ہے۔

صبح کے وقت جب سورج افق کی چلمن ہٹا کر جھانکتا ہے اور کھیتوں میں ہوا سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی چلتی ہے تو شبنم اپنی نورانی آنکھ کھولتی ہے۔

"آہ میں کہاں ہوں" وہ چلاتی ہے۔ "اُف میرے اللہ! آسمان کس قدر

بلند ہے! کیا میں ایسے زوال پذیر جذبے کے لئے اپنے نشیمن سے ٹوٹ گری ہوں۔" اِس طرح کہتی ہوئی وہ سورج کی کرن کے ساتھ لٹک جاتی ہے۔

پھول اپنی پنکھڑیاں اس کو لینے کے لئے پھیلا دیتے ہیں۔ سمندروں کی موجیں اس کو گود میں لینے کے لئے اُچھلتی ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اس کی راہ روکنے کے لئے بلند ہو جاتی ہیں۔ لیکن ——— وہ اپنے گھر بلند آسمانوں کی طرف اُڑ جاتی ہے ؏

حادثہ

پارک سرکس گارڈن کے وسطی چبوترے پر کھڑے ہو کر اس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ گھاس کے ایک تختے پر بچے کھیل رہے تھے۔ ان کی گاڑیاں روش کے ایک کنارے لگی تھیں۔ اور ان کی کھلائیاں اُن کے قریب بیٹھی ہوئی گفتگو میں مصروف تھیں۔ دومن کالج والی سڑک سے لڑکیوں کا ایک جھنڈ قہقہے لگاتا ہوا باغ میں داخل ہوا۔ باغ میں داخل ہوتے ہی وہ منتشر ہو گئیں۔ کچھ لڑکیاں گھاس کے دائیں تختے پر ٹہلنے لگیں اور کچھ آگے نکل گئیں۔ سامنے کی روش پر ایک معمّر انگریز خاتون چھوٹا سا پلّا لیے آ رہی تھی۔ کتّا بار بار بچوں کی طرف لپکتا تو خاتون لرزتی ہوئی آواز میں پکارتی "جمی" کتّا مہین آواز سے بھونکتا، اور اس کا سارا جسم تھرتھرانے لگتا۔ باغ کے دوسری طرف لڑکوں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ فٹ بال کا کھیل جاری تھا۔ وہ کچھ دیر

ٹھٹک کر اسی طرف چل دیا۔

فٹ بال کی گراؤنڈ کے پرلی طرف عمارتوں کے پیچھے سے سُرخ رنگ کا سورج اُبھر رہا تھا۔ گھاس کی نازک پتیاں کرنوں کی طلائی تابش سے تھرتھرانے لگیں۔

توانائی سے لبریز کھلاڑیوں کے درمیان گیند واقعی بے بس، بے جان چیز کی طرح لڑھک رہی تھی۔ ان کے جسموں سے پسینے کے دھارے پھوٹ رہے تھے۔ اور وہ خوشی سے چلّا رہے تھے۔ گراؤنڈ کے گرد سیر کرنے والوں کا جمگھٹا لگ گیا تھا۔ کچھ بالکل غیر جانبدارانہ طور پر کھیل سے حظ اٹھا رہے تھے۔ اور کچھ کھیل میں اس طرح جذب ہو گئے تھے گویا ان کی پوری زندگی اس کھیل کی فتح و شکست پر منحصر تھی۔ اس کے قریب ایک نوجوان بڑے جوش و خروش سے کھیل میں حصّہ لے رہا تھا۔ جب کوئی کھلاڑی چوک جاتا تو اس کے گلے سے ایک غرغرہ سا بلند ہوتا۔ اسکی حالت اس وقت قابلِ دید تھی جب گیند گول کے قریب پہنچی صرف ایک ٹھوکر کی ضرورت تھی اور وہ پار تھی۔ وہ واقعی بے تابی سے دوہرا ہوا جاتا تھا۔ وہ کھلاڑیوں کو اُبھار رہا تھا۔ اور زور زور سے چلّا رہا تھا۔ لیکن جب حزبِ مخالف کے ایک کھلاڑی نے نہایت صفائی سے گیند کو اس پرخطر مقام سے دُور پھینک دیا تو اس کا جذبہ اس طرح ٹھنڈا ہو گیا جس طرح کوئی مریض موت سے کشتی لڑتے لڑتے تھک جائے۔ اور بالآخر اپنے آپ کو موت کے سپرد کر دے۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کا نیا سوٹ پہنے ہوئے اور آنکھوں پر ٹھنڈے چشمے لگائے ہوئے تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے

وہ دفتر کی طرف جا رہا تھا لیکن کھیل نے اس کے پاؤں جکڑ لئے۔ جب وہ اپنے ہاتھ اُوپر اٹھاتا تو اس کی اندرونی جیب میں سیاہ رنگ کا چمکدار بٹوہ بھی نظر آ جاتا۔

وہ اس کے قریب ہوا۔ یہاں تک کہ اس کا بازو اس کے بازو سے چھونے لگا۔ اور شانہ شانے سے مل گیا۔ کچھ منٹوں کے بعد وہ وہاں سے چل دیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ نوجوان بدستور چلاّ رہا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں کو ہوا میں اس طرح بلند کر رہا تھا۔ کہ اس کے قریب اگر کوئی میز ہوتی تو مکّے مار مار کر اس کا تختہ توڑ دیتا۔ اس نے تیزی سے قدم اُٹھائے۔ اور باغ سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ پیدل چلنے والوں کے لئے بنے ہوئے راستے پر اینگلو انڈین لڑکیاں پھول دار گلابی فراک اور سر پر تنکوں کے بنے ہوئے کنول سے ہیٹ پہنے بس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ وہ اس وقت بٹوے کو کھول کر دیکھنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ چنانچہ وہ سڑک کے کنارے ایک کھمبے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اور بٹوے کو اپنی جیب سے نکالا۔ اس کے ہاتھوں میں بٹوا چرمرایا۔ جب اُس نے اُسے کھولا تو اس کے اندر دو نیلے نیلے نوٹوں نے اپنی جھلک دکھائی۔ اس نے بٹوے کی دوسری تہہ کو ٹٹولا۔ اس میں ایک بل تھا اور ایک ٹریم کا پرانا ٹکٹ۔ اُس نے بل اور ٹکٹ دونوں پھاڑ دیے اور بٹوہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اس کی ہنسی نہ تھمتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا جب وہ نوجوان اپنا گلا پھاڑنا اور اُچھلنا بند کرے گا۔ اور بس اسٹینڈ کے پاس پہنچ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے گا

تو اس کی شکل کیسی بن جائے گی؟ کیا وہ پھر بھی ویسے ہی چلائے اور اُچھلے گا؟

وہ ٹریم شیڈ میں آگیا۔ اور دھرم تولہ کی طرف جانے والی ٹریم میں بیٹھ گیا۔ ٹریم میں اس سے قبل کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کی نشست پر ایک چینی جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے متورم پپوٹے اور زرد چہرے اس کے دل میں جذبہ رحم اکسانے لگے۔ وہ چپ چاپ بیٹھے اندر داخل ہونے والے لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب ٹریم چلی تو وہ طمانیت قلب کے پورے احساس اور فراغت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آج ٹریم میں بھیڑ نہ تھی۔ بعض بس اسٹاپ تو بالکل ہی خالی تھے بازاروں میں کئی دکانوں پر ابھی تک پردے گرے ہوئے تھے۔ حالانکہ سورج کی روشنی درختوں کے زیریں حصوں کو روشن کر رہی تھی۔ اس نے اپنی جیب سے پیلے ہاتھی کی ڈبیا نکالی۔ اور اس میں سے ایک آخری کچلا ہوا سگریٹ نکالا۔ ٹریم کی کھڑکیوں میں سے ٹھنڈی ہوا فراٹے بھرتی ہوئی آئی۔ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور دھواں ہوا میں چھوڑا۔

ایکاایکی اس نے اپنے قریب ایک زنانہ نشست سے ہلکے ٹھسکے کی آواز سُنی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک جواں سال اینگلو انڈین لڑکی اس کی طرف پشت کئے بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں کا گندھا ہوا گچھا گردن کے اوپر ایک غبارے کی مانند لٹک رہا تھا۔ اس نے ملگجا جونتی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔

ٹریم گڑگڑاتی ہوئی تیرتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی تاروں سے بجلی کا ایک شرارہ

تڑاق سے ٹوٹتا اور فضا میں بکھر جاتا۔ اس نے ایک اور کش لگایا۔ اور پوری فراغت سے دھواں ہوا میں چھوڑا۔ اُس نے اپنے قریب میں اخ اخ کی آواز پھر سُنی۔ لڑکی نے اپنا منہ رومال میں چھپا لیا۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ پھر لڑکی نے سر اٹھایا اور اس کی طرف پُر غضب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا "آپ اسے بند کریں گے یا نہیں؟"

اس نے سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے کی طرف دیکھا اور جواب دیئے بغیر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ لڑکی کے خال وخد کافی جاذبِ نگاہ تھے۔ اگرچہ وہ گندم گوں تھی۔

ہیریسن اسٹریٹ کے نزدیک بہت سے مسافر اتر گئے۔ اور ٹریم کی نشستیں قریباً خالی ہو گئیں۔ چینی جوڑا کھسک کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اب اس کے قریب دور تک کوئی مسافر نہ بیٹھا تھا۔ اس لئے اس نے نشست کی پشت پر سر لگا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ لڑکی بدستور سربلند کئے بے پروائی کے ساتھ سامنے کی طرف دیکھتی رہی ہیریسن اسٹریٹ سے کچھ آگے ٹریم پھر رُک گئی۔ اور ایک بوڑھا دلّوی اندر داخل ہوا لڑکی نے اِدھر اُدھر عمارتوں کی طرف دیکھا۔ اور وہ معاً کسی خیال کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جب وہ جلدی سے اُس کے پاؤں کے پاس سے گزری تو اس کا پاؤں اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں میں اُلجھا۔

"کتا" اس نے اس کی طرف شعلہ بار نگاہ سے دیکھا۔

اچانک اسے کچھ سوجھا اور وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں عین چلتی ہوئی ٹریم میں سے اُترے۔ جلدی میں اُترتے ہوئے لڑکی کا پاؤں رپٹتے رپٹتے بچا۔ وہ راستے سے ہٹ کر کھمبے کے قریب کھڑی ہوگئی اور اپنے سفید جوتے کا تسمہ باندھنے لگی۔

"تم میرے پیچھے پیچھے کیوں آ رہے ہو؟" لڑکی نے پھر پوچھا۔ اس کی آنکھیں غصہ سے چمک رہی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کے ہونٹ پہلے سے موٹے ہو گئے تھے۔

"اور تم نے مجھے کتا کیوں کہا؟ میں بھی ایک اِنسان ہوں۔ انسانوں کے درمیان پلا۔ بڑھا اور انہی سے لین دین کرتا ہوں۔ کیا میں اِس قدر قابلِ نفرت ہوں؟"

اب وہ دونوں ایک ساتھ چل رہے تھے۔

"کیا واقعی میں بہت مکروہ ہوں؟" اس نے پھر پوچھا۔

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور چُپ ہو گئی۔

"تم ٹانگیں پھیلا کر کیوں بیٹھتے ہو؟"

"میں تمہیں اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤں گا۔ میں آج بہت خوش ہوں۔ صبح صبح ہی ہاتھ گرم ہو گئے۔ آؤ کسی ریستوران میں بیٹھ کر اورنج اسکوئش پئیں۔"

گلی کی نکڑ پہ ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ جس کے دروازے کے شیشوں میں سے کونٹر نظر آ رہا تھا۔ اس پہ ایک لڑکی بیٹھی سلائیوں سے اُون بُن رہی تھی۔ کونٹر کے آگے بلند اسٹول پڑے ہوئے تھے۔ دونوں اسٹولوں پہ اچھل کر بیٹھ گئے۔ اور لڑکے

سے رس پینے لگے۔

"میں آج نہایت تازہ دم ہوں۔ جی چاہتا ہے آج کا سارا دن سیر میں کاٹیں میرا خیال ہے۔ تم فارغ ہو گی؟" اس نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ مشروب کی سطح پر تیرتے ہوئے بلبلوں کو دیکھنے میں محو تھی۔

"میں کچھ زیادہ مصروف نہیں" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

ریستوران میں دو بنگالی چائے پی رہے تھے۔ وہ اس تیزی کے ساتھ بول رہے تھے گویا وہ لڑ رہے ہوں۔ وہ چائے کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے اور ایک فقرہ بول دیتے۔ بھارت کے تازہ بیوپار پر وہ ایک سیر حاصل بحث کر رہے تھے۔

"میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ لوگ جب مر جائیں گے تو ان کے لشرے کیا کہیں گے کہ ہم نے بھی زندگی بسر کی تھی" لیکن وہ تیرتے ہوئے بلبلے دیکھنے اور رس چوسنے میں مصروف رہی۔

بازار میں یک دم ایک شور سا بپا ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے کے شیشے میں سے لوگوں کا ایک جم غفیر گذرتا دکھائی دیا۔ وہ ایک غیر منظم جلوس کی شکل میں جا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر لوگ دوڑ دوڑ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہیں آگ لگ گئی تھی۔ بازار کا سکوت بلند بانگ مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے بھر گیا۔ وہ دونوں باہر نکل آئے۔ اور ریستوران کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو گئے۔ جذبات کا ایک سمندر موجیں مار رہا تھا۔ لوگ اپنی ٹوپیاں اچھال رہے تھے۔

اور اپنے گلے پھاڑ رہے تھے۔ اس نے دیکھا۔ لڑکی کا چہرہ اِس تلاطم سے متاثر ہو رہا تھا۔ جو انسانی جوش و خروش کو دیکھ کر دیکھنے والے کے دل میں ہو جزن ہوتا ہے۔ جب جلوس گزر گیا اور کچھ سکون ہوا تو وہ بولی "وہ جنونی ہیں۔ ہجوم ہمیشہ جذبات سے کھیلتا ہے۔ ایسے مظاہروں سے مجھے قدرتی طور پر نفرت ہے۔ مَیں ایسے جذباتی جھونٹے کو سخت ناپسند کرتی ہوں۔ جس کا انجام ہمیشہ سر کے بل گرنا ہوتا ہے۔"

بازار میں چند ایک دکانیں کھل گئی تھیں۔ جن کے اندر اکّا دکّا گاہک داخل ہو رہا تھا۔ کلکتے کی وہ رونق آج کہاں تھی؟ وہ پہلو بہ پہلو چلتے جا رہے تھے۔ اور ان کے قریب سے خوش پوش لوگوں سے بھری ٹرامیں سَن سَن کرتی ہوئی گزر گئیں دھرم تولہ اسٹریٹ میں قدرے رونق اور چہل پہل تھی۔ اخبار بیچنے والے اخبار کی سرخی چلّا چلّا کر سنا رہے تھے۔ وہ ایک پھیری کی طرح ہجوم میں گھوم رہے تھے۔ جا بجا لوگوں کی ٹولیاں اخبار لئے پڑھ رہی تھیں۔

چورنگی اسکوئر میں ٹراموں کا ہجوم تھا۔ اور گھنٹیاں ایک ہم آہنگ شور کی طرح ٹنٹناتی چاروں طرف دوڑ رہی تھیں۔ اسکوئر کے پرے گھاس کے تختے پر جہاں سے وکٹوریا میموریل اپنی پوری عظمت سفیدی اور بلندی کے ساتھ آسمان کے کنارے پر کھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ بیٹھ گئے۔ گھاس کے میدان میں کئی لوگ دور و نزدیک درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی نے اپنا تنکوں کا ہیٹ اتار کر پاس رکھ لیا۔ ہیٹ کے اوپر سرخ رنگ کا فیتہ گھاس میں سے سُرخ پھول کی طرح اُبھرا ہوا تھا۔ وہ

کہہ رہی تھی " کتے، وہ کتوں کی طرح سونگھتے ہوئے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اور جب وہ کسی شے کو دیکھ پاتے ہیں تو خوش ہو کر لپکتے ہیں۔ اور خوشامد سے دم ہلانے لگتے ہیں۔ دنیا میں بہت کم مرد حقیقتاً مرد ہیں "

وہ کہیں دُور دیکھ رہی تھی۔ گھاس کی موجیں اڑتی ہوئی وکٹوریا میموریل کے قدموں کو چُوم رہی تھیں میموریل کے ساتھ گرجا گھر کے بلند مینار کا عکس جھیل میں تھرتھرا رہا تھا۔ گرجا گھر کا گھنٹہ آہستہ آہستہ بجنے لگا۔ گھنٹے کی آواز انسانوں کے شور کو سمیٹتی ہوئی اپنے ساتھ لئے جا رہی تھی۔

"بعض تو اِس قدر واہیات ہوتے ہیں کہ باوجود دھتکارنے کے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اور جب وہ جوتے کی ایک ٹھوکر کھا لیتے ہیں۔ تو سر سے خاک جھاڑتے ہوئے چل دیتے ہیں۔ پھر وہ ایسی صورت بنا لیتے ہیں۔ جیسے رومان کی کسی وادی سے لوٹ رہے ہوں۔ جس کی کیفیت ناقابلِ بیان ہے۔ جدید عاشق ایک بیوقوف بکروٹا ہے۔"

"کیا تم نے کبھی کسی سے محبّت بھی کی؟"

لڑکی نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں یوں دبا لیا گویا کسی گرم مشروب کے ایک جُرعہ نے اس کے ہونٹ جلا دیے ہوں۔

"تم مجھے اتنا بے حس خیال کرنے لگے؟ مَیں نے محبّت کی لیکن اس سے بیزار ہو گئی۔"

"تو یہ خیال غلط ہے کہ محبّت دائمی ہوتی ہے؟"

"بالکل غلط، جو محبت کسی فہم کے بغیر صرف بدنی لذّت کے لئے کی جائے۔ وہ ناپائدار اور لمحاتی ہوتی ہے۔ ہندوستانی لوگوں میں شادیاں اگر پائدار ہوتی ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ عورت مرد کی محبت کی بنیاد اولاد کی محبت پر استوار ہوتی ہے لیکن ہم لوگ کچّے بیروں کی مانند ہیں۔ کہ جنہیں نہ تو درخت قبول کرتا ہے۔ اور نہ کھانے والا۔"

"تو تم اس سے جدا ہو گئیں؟"

"ہاں ایک مدت کی رومانی زندگی بسر کرنے کے بعد انسان سنجیدہ بننا چاہتا ہے وہ شادی کی اوّلیں بے وقوفیوں سے نکل کر ایک باضابطہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ پھر گھر بسانے کی ایک خواہش ہوتی ہے اور سنسان کمروں کے اندر کسی کے رونے چلاّنے اور مچلنے کا شور سننے کی تمنّا ہوتی ہے۔ میری اور اس کی ناچاقی اسی بنا پر ہوئی تھی۔ کیا میں حق بجانب نہ تھی؟"

وہ چپ ٹرمیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ جو لوہے کی پٹڑی پہ پھسلتی جا رہی تھیں۔ لڑکی کی آنکھوں میں ایک لپک سی پیدا ہو گئی۔ اس کی آواز داخلی اضطراب سے لڑکھڑانے لگی۔

"مجھے مردوں سے نفرت ہے، نفرت، میں اس لعین کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔"

"صرف اسی وجہ کے لئے؟"

"صرف اسی وجہ کے لئے ـــــ اس نے میری گود کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پائمال کر دیا۔ اس نے مجھے قصداً بچوں کی محبت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔ اس نے میرے جسم کو ہمیشہ کے لئے اپنی تمناؤں کا بوجھ اٹھانے کے ناقابل کر دیا۔ ظالم!"

اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ لیکن ضبط کے باوجود اس کے بھنچے ہوئے منہ سے سسکیوں کی آواز کھسک گئی۔ اس نے یکایک محسوس کیا۔ گویا اس کو لڑکی سے محبت ہوگئی تھی۔

سڑک کے کنارے ریستوران میں بینڈ بجنے لگا۔ بینڈ کے سُر اتنے ہلکے پھلکے تھے کہ اُس کا دل تھرکنے لگا۔ اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ریستوران کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بینڈ کے سُر اب ایک تال پر بج رہے تھے۔ غیر شعوری طور پر دونوں کے گھٹنے بینڈ کے تال پر جھولنے لگے۔

"لیکن عورتیں بھی تو ویسی ہی بے وفا ہوتی ہیں۔" اس نے کہا۔

لڑکی اپنے خیال میں جذب اپنے گھٹنے ہلا رہی تھی۔ غالباً اب لنچ کا وقت تھا

"عورتیں سرکش ہوتی جا رہی ہیں۔ مردوں کی طرح وہ بھی اپنے حقوق طلب کر رہی ہیں، اگر ایک مرد ایک بیوی اور چند محبوبہ رکھ سکتا ہے تو عورت کیوں نہ ایسا کرے! وہ کیوں ایک کھونٹے کے ساتھ باندھ دی جائے؟"

لیکن لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سامنے سے لدی پھندی ٹرمیں گھنٹیاں بجاتی آ رہی تھیں۔ گرجا گھر کے گھنٹے نے دو کی خبر دی۔

"دو بج گئے؟" لڑکی نے تعجب سے اِدھر اُدھر سایوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سورج نصف النہار سے گزر چکا تھا۔ اور درختوں کے پتوں میں سے دوپہر کی تھکی ہوئی دھوپ چھن چھن کر گھاس پہ لوٹ رہی تھی۔ وکٹوریہ میموریل کی سفیدی طلائی تابش سے دمک رہی تھی۔

"مجھ کو جانا چاہیے۔" اس نے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مت جاؤ۔" اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مجھ کو جانا ہے۔" لڑکی نے مصمم طور سے کہا۔ اس نے اپنا ہیٹ پہن لیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے محسوس کیا۔ گویا اس کا دل کسی ایسے کنوئیں میں گر رہا ہے۔ جس کی کوئی تہ نہیں۔ اتنی مختصر سی ملاقات! اس کے دل میں ہلکا سا درد ہونے لگا۔

"کیا میں پھر کبھی مل سکتا ہوں؟"

وہ کچھ وقفہ تک چپ سامنے دیکھتی رہی۔ "ہاں کلکتہ کی کسی گلی میں کسی روز تمہاری میری ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"میں تمہاری جائے رہائش معلوم کر سکتا ہوں۔"

لیکن لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ دیر تک چپ کھڑا رہا۔ پھر بولا "میں بہت سی لڑکیوں سے ملا لیکن میں نے کسی کے ساتھ اتنی موافقت اور انس محسوس نہیں کیا۔ جتنا کہ تمہارے ساتھ، تم ویسی ہی گنہگار ہو۔ جیسا کہ میں، لیکن آج میں محسوس

کر رہا ہوں۔ ہم گنہگار نہیں ہیں مظلوم ہیں۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ خود نہیں کر رہے ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔"

وہ اس پر بھی کچھ نہ بولی تو اس نے کہا "میں تمہارا نام معلوم کر سکتا ہوں کبھی کبھار تمہیں تمہارے نام کے ساتھ یاد کر لیا کروں گا۔"

"ایولین۔"

"شکریہ!"

وہ گھاس پر گر پڑا۔ لاجونتی فراک میں وہ ایک تیتری کی طرح دکھائی دے رہی تھی اس کے ہیٹ پر سُرخ نیتے کا پھول کتنا بھلا نظر آ رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کچھ دیر تک کھڑی ٹریموں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر یک دم ایک ٹریم پر اچھل کر سوار ہو گئی۔ وہ اس وقت چھوٹی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ وہ ایک بار مڑ کر ضرور اس کی طرف دیکھے گی۔ مگر وہ ہجوم میں گم ہو گئی۔

وہ یکایک بہت ہی مغموم ہو گیا۔ درخت کے اوپر کوئی پرندہ عجیب طرح سے چہچہا رہا تھا۔ پھر ایکا ایکی اس کی چہچہاہٹ کوئل کے نغموں میں پھوٹ پڑی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی اور پیپل کے پتے کھڑکھڑانے لگے۔ اس کے قریب گھاس پر ایک بنگالی مرد عورت اپنے بچے سمیت آ کر بیٹھ گئے۔ بچہ اپنی نفیری زور زور سے بجانے لگا۔ اور کوئل اڑ گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ چلے گئے۔ اور ایک تھکا ماندہ کلرک آ کر بیٹھ گیا۔ ٹریموں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں لیکن اُن کی آواز میں کتنی افسردگی اور حزن تھا ایسا حزن

جو ہندوستانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ان کی بانسری کی لے۔ ان کے شعروں کے نغمے سب مغموم اور دل کو جلا دینے والے ہوتے ہیں۔

وہ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر ایسا سنائی دیا۔ جیسے شہر بڑی بڑی ڈکاریں لے رہا ہے۔ چورنگی میں ٹرمیں رک گئیں اور پولیس کی لاری دندناتی ہوئی گذر گئی۔ اس نے اس امر کی پروا کیے بغیر اپنا کوٹ اٹھایا۔ اور ایڈن گارڈن کی طرف چل دیا۔ اس کی آنکھیں نیند اور جذبات سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

وہ گھاس کو روندتا اور سڑکوں کو عبور کرتا ایڈن گارڈن میں پہنچ گیا۔ باغ میں زیادہ لوگ نہ تھے۔ کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ درختوں کے سائے میں پڑے سستا رہے تھے۔ وہ چینی پگوڈا کے قریب درختوں کے جھنڈ میں چلا گیا۔ اور ایک بنچ پر کوٹ کا تکیہ بنا کر سو گیا۔

کہیں دور گولیوں کی کرخت تڑتڑ نے اسے جگا دیا۔ باغ میں ایک متنفس بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہ کیا؟ اس نے اپنے کانوں پر زور ڈال کر سننے کی کوشش کی۔ شہر کی سمت سے مدھم ڈکاروں کی آواز پھر آنے لگی۔ غالباً پولیس نے گولی چلا دی۔ بہتا ہوا خون اور پرخطر الم دیکھنے کا یہ جذبہ اسے کشاں کشاں لے گیا۔ اس سمت میں جہاں گولیاں چل رہی تھیں۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی نکٹائی ہوا میں اڑتی جا رہی تھی اس نے باغ کے وسیع قطعے بھاگتے ہوئے عبور کیے اور وکٹوریہ میموریل کے پاس آ گیا۔ جو اپنی عظمت اور رفعت کے ساتھ چپ کھڑا تھا چورنگی میں ایک بھی ٹریم موجود نہ

تھی۔ فوج کی لاریاں دندناتی ہوئی جا رہی تھیں۔ جن کے پیچھے ریڈ کراس کی سفید ایمبولینس آواز پیدا کئے بغیر گزر گئیں۔ دھرم تولہ کی طرف؟ —— بازار خالی تھا۔ دو دو کانوں کے ٹوٹے ہوئے تختے سڑک پر گرے ہوئے تھے۔ اور کانچ کے بڑے بڑے ٹکڑے جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ پولیس کی سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ وہ مڑا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔

کلکتہ سنسان ہو گیا تھا۔ گولیوں کی آواز پھر آئی —— کس طرف سے؟

ایک کرخت سیٹی اس کے کان میں میخ کی طرح چبھی۔ بھاری فوجی بوٹوں کے ایک قدم چلنے کی کھٹ کھٹ عمارتوں کو ہتھوڑے کی طرح ٹھنکار رہی تھی۔ وہ اس گلی سے مڑ کر دوسری گلی میں داخل ہوا۔ اور چورنگی سے کچھ فاصلے پر نکل آیا۔ فوجی ٹرک سائیں سائیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کے اوپر سپاہی آہنی خود پہنے ننگی سنگینیں بلند کئے کھڑے تھے۔ پھر چار آگ بجھانے والے انجن گڑگڑاتے ہوئے گزرے۔ ان کی ہولناک گھنٹیاں موت کی آمد کی طرح زور زور سے بج رہی تھیں۔

شہر تھرتھرانے لگا۔

ایک نامعلوم خوف اس پر طاری ہو گیا۔ وہ تیر کی طرح بھاگا۔ اور سڑک کی دو ایک پچھواڑی گلیاں عبور کر کے وکٹوریا میموریل کے سامنے گھاس کے میدان میں آگیا۔ وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا اور لمبی لمبی گھاس میں رینگتا ہوا پھر اس بنچ پر آگیا۔ اب سیٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔ اور لاریوں کی گڑگڑاہٹ اور سائیں سائیں

یہاں بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ بنچ سے اُٹھ کر کیرنے کی ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

سورج نیچے جا رہا تھا۔ اور اس کی آخری کرنیں سرو کے بلند درختوں کی نوکیلی چوٹیوں پر منڈلا رہی تھیں۔ سیٹیاں اب بند ہو گئی تھیں۔ کبھی کبھار لاریوں کی سائیں سائیں سنائی دیتی۔ کسی پرندے کی چہچہاہٹ سنائی نہ دے رہی تھی۔ حالانکہ ہُگلی کی لہروں سے کھیلتی ہوئی ہوائیں اب پھول پتوں میں سرسراہٹ پیدا کر رہی تھیں شام کے وقت ایک مڈا اس کے قریب ہی زور سے بولا اور چُپ ہو گیا۔

شام کی سیاہی آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی۔ آسمان ایک مٹیالے رنگ کا لہنگا دکھائی دے رہا تھا۔ کلکتہ گہرے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی۔ آج کئی انسان کلکتہ کی پُر ہنگامہ زندگی کو چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے! کہاں؟ ایکا ایکی اُس نے محسوس کیا۔ گویا آسمان سے کوئی پُر ہیبت شخصیت زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے تمام جسم میں تھرتھری سی پیدا ہونے لگی۔ آج نہ جانے کن کن سڑکوں پر انسانوں کے مردہ جسم پڑے ہوں گے۔ جن کے سینوں سے رستے ہوئے خون کے دھارے بل دار راستے بناتے ہوئے نکل رہے ہوں گے۔ اللہ انسان کے خون میں کیا حدت اور سوز ہے؟ وہ اس لڑکی کی طرح محسوس کر رہا تھا جس کے جسم میں سے رحم نکال کر پھینک دیا جائے۔ اور وہ کرم خوردہ درخت کی کوکھ کی طرح کھوکھلی رہ جائے۔

ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ باغ گہری سیاہی میں ڈوب گیا۔ وہ اُٹھا اور دریا کی طرف چل دیا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ بیٹھ گیا۔ دریا کے پرلی طرف کی عمارتیں سیاہ ڈبوں کی طرح ایک ساتھ جڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں ہُگلی کا پُل کسی دیو کے ہاتھ کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ آسمان کے مغربی گوشے سے بادلوں کے چند ملگجے ٹکڑے تیرتے اُبھر آئے۔ اور مچھلی کے کھپروں کی طرح پھیل گئے۔

وہ گھاٹ کے نیچے اتر کر پانی کے کنارے بیٹھ گیا۔ چاندی رام گھاٹ کے قریب ایک اسٹیمر کھڑا تھا جس کی سُرخ بتی جل رہی تھی۔ دوسری کشتیاں گھاٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ ان میں کوئی بتی روشن نہ تھی۔ اس نے جھک کر پانی میں دیکھا گدلے پانی کی لہریں ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ اُس نے چلّو میں پانی لیا اور سوچا۔ دریا میں پانی کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟ یہ زندگی کیا ہے؟ کیا یہ صرف ایک حادثہ ہے۔ جس طرح ایولن ملی اور اپنے وصال کے میٹھے زہر سے ڈس کر چلی گئی؟ ؟

سنہ ۱۹۴۷ء

(میرے گاؤں کے چند منظر)

دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں چار سکھ سوار نہر کے پل پر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے جو فربہ اور معمّر تھا، اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے اردگرد نگاہ ڈالی کپاس کے قریبی کھیت میں ایک کاشتکار نلائی کر رہا تھا۔ چاروں نے اپنے گھوڑوں کا رُخ اسی طرف پھیر دیا۔

فربہ اور معمّر سوار نے نہایت شریفانہ انداز میں کاشتکار سے کہا: "بھائی ہمیں پینے کے لئے پانی مل جائے گا؟"

نلائی کرنے والے نے اُن کی طرف دیکھا، وہ دل میں ڈرا۔ اُس نے کھُرپی پھینک دی اور بڑے ادب سے کہا "جی ہاں سائے میں بیٹھئے۔ میں ابھی پانی لائے دیتا ہوں۔"

چاروں شخص گھوڑوں سے اُتر آئے اور سائے میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے پاس لمبے لمبے نیزے تھے۔ اُن کے اعلیٰ النسل کے دراز قد گھوڑے ہنہناتے اور زور سے زمین پر اپنے سُم ٹپک رہے تھے۔

پانی پینے کے بعد انھوں نے ممنونِ احسان نگاہوں سے پانی پلانے والے کو دیکھا اور اس کا نام پوچھا۔ کاشتکار نے اپنا نام غلام حسن بتایا۔

پھر سواروں میں سے ایک سوال کیا "کہو بھائی تمہارے گاؤں میں تو خیریت ہے؟"

غلام حسن نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا "جناب اس وقت تک تو خیریت ہے۔ اس سے اگلی گھڑی کا علم نہیں۔"

فربہ اور معمّر آدمی نے اسی شر لیفانہ انداز سے کہا "بھائی امن اور خیریت ہی کی دُعا کرنی چاہیئے۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے فائدہ کیا؟"

اس کے بعد جب سوار جانے کے لئے تیار ہوئے تو غلام حسن نے یہ سوچ کر کہ ان سے پُوری واقفیت تو حاصل کر لینی چاہیئے۔ سوال کیا۔

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"ہم چک نمبر ۱۲۵ سے آ رہے ہیں۔"

"اور کدھر کا ارادہ ہے؟"

سب سے اگلے سوار نے کچھ جواب دیا، مگر غلام حسن سمجھ نہ سکا اور وہ چلے گئے۔

گھاس کھودنے سے فارغ ہونے کے بعد جب غلام حسن چھکڑا اپنے گاؤں کی طرف لوٹ رہا تھا، اُسے ابراہیم ٹھیکیدار کے مربع کے قریب فقیر ارائیں ملا۔ علیک سلیک کے بعد گفتگو شروع ہوئی تو غلام حسن نے سواروں کا قصّہ سنایا۔ قصّہ سننے کے بعد فقیر نے وہی سوال کیا۔ جس کا جواب خود غلام حسن بھی معلوم نہ کر سکا تھا۔

غلام حسن نے کہا، "میرا خیال ہے وہ چک نمبر ۲۴۳ کی طرف گئے ہیں"۔

فقیر نے تعجّب اور گھبراہٹ سے پوچھا، "چک نمبر ۲۴۳ کی طرف؟ ۲۴۳ میں تو سکھوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہو رہا ہے۔"

جب یہ گاؤں میں پہنچے، چکّی کے پاس الٰہ بخش اور صالح کھوجی آپس میں ایک بچھڑے کا سودا کر رہے تھے۔ بچھڑا الٰہ بخش کا تھا اور صالح کھوجی خریدار تھا۔

"تم جانتے ہو مَیں اسے پورے ایک سال سے پال رہا ہوں۔ یہ مجھے اپنی جان سے بھی عزیز ہے"۔

صالح کھوجی نے ذرا تیزی سے کہا، "پاگل اسی لئے تو میں بھی ڈھائی سو روپے قیمت دے رہا ہوں"۔

فقیر بھی اس پُر لذّت گفتگو میں شریک ہو گیا۔ ایک کاشتکار کے لئے اس سے زیادہ پُر لطف موقع کیا ہو سکتا ہے۔ بیلوں کا ایک موضوع ہو اور کوئی کاشتکار اس میں حصّہ نہ لے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔

جب بہت بحث تکرار کے بعد بھی اللہ بخش تین سو روپیہ سے ایک دمڑی کم لینے پر راضی نہ ہُوا، تو صالح نے تنگ آکر کہا: بڑے ضدّی ہو۔ خدا جانے کل کو کیا ہو جائے، کمبخت سکھوں کے معلوم نہیں کیا کیا خطرناک ارادے ہیں!"

اِس پر فقیر بولا: "تم نے سُنی وہ بات؟ آج غلام حسن کو چار سکھ ملے۔ وہ برچھیوں، بندوقوں، اور پستولوں سے لیس تھے۔ چک نمبر ۲۴۳ کی طرف گئے ہیں۔ جہاں سکھوں کا ایک بھاری جلسہ ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ کسی حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

"اور تم کیا سمجھتے ہو، کیا وہ غافل بیٹھے ہیں؟ وہ مسلمانوں کی طرح غافل نہیں ہیں آج افضل نے خبر سنائی کہ سکھوں نے ہوشیار پور کے قریب مسلمانوں کے چار گاؤں بالکل خاکستر کر دیے ہیں اور مسلمانوں کے دودھ پیتے بچّوں کو مار ڈالا ہے۔"

اتنے میں مستری نور بھی دکان سے باہر نکل آیا۔ وہ ابھی ابھی ایک تلوار بنا کر آیا تھا۔ بھٹّی کے سامنے بیٹھے بیٹھے اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ جب اُس نے غلام حسن کا واقعہ سُنا تو وہ تیز ہو کر بولا: "ہوش کی دوا کرو۔ سکھ حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور اگر اُنھوں نے حملہ کر دیا تو یہ یاد رکھو کہ وہ مسلمانوں کو (اپنی ہتھیلی اوپر اٹھاتے ہوئے) یوں ہتھیلی پر اٹھا لیں گے۔"

صالح بولا: "میری بات سنو، میں تمھیں بتاتا ہوں۔"

لیکن مستری اپنے جوش میں بولتا گیا: "مسلمان تو ہتھیار بنوانے سے بھی ہنزا"

ہیں۔ غور کرو تلوار بنانا کتنا کٹھن کام ہے۔ اس کی اجرت کیا دس روپے زیادہ ہے! آج عبداللہ نے تلوار بنوائی۔ صبح سویرے سے لیکر دوپہر تک بھٹی کے سامنے بیٹھے بیٹھے میرا جسم بھی کوئلہ ہو گیا۔ اور وہ پانچ روپے پھینک تلوار لے چلتا بنا۔"

چکّی کے پاس لوگ برابر جمع ہوتے جا رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ سیاسیاتِ حاضرہ کا موضوع زیادہ سرگرمی سے کھنگالا جانے لگا۔ مجلس معلوم نہیں کتنی دیر تک ختم نہ ہوتی۔ اگر قریب کے جوہڑ میں دو بھینسیں آپس میں گتھم گتھا نہ ہو جاتیں۔ دونوں کے سینگ لڑتے لڑتے ایک دوسرے میں الجھ گئے تھے۔ اسمٰعیل نے فقیر کو آواز دی وہ جوہڑ کی طرف لپکا اور اس کے پیچھے دوسرے لوگ بھی اُدھر کو دوڑے۔ بڑی تگ و دو کے بعد ان لوگوں نے بھینسوں کو علیحدہ کیا اور اس کے بعد بھینسوں کی لڑائیوں کا ذکر کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر جب نمازی مسجد سے نکلے تو مہر شہاب دین نے امام صاحب سے کہا "میاں جی! آپ نے سنا، غلام حسن کو آج چالیس سکھ ملے۔ انہوں نے اُسے پستول دکھا کر ڈرایا اور کہا تیار رہو جاؤ ہم حملہ کرنے والے ہیں"۔

یہ خبر واقعی بڑی تشویش انگیز اور خوفناک تھی۔ شام کے وقت جب یہ خبر گلاب خان تک پہنچی تو اُس نے اپنے سر سے پگڑی اتار کر کھٹیا کے پائے پر رکھ دی اور کہا "بس اب خاتمہ سمجھو"۔

گلاب خاں اس وقت گنگا رام کی دکان کے سامنے بیٹھا تھا۔ فضل قصائی بھی وہیں موجود تھا اور اللہ دتا بھی۔ گلاب خاں کے الفاظ نے سب پر مایوسی طاری کر دی۔ کچھ دیر تک وہ چپ بیٹھے حقہ پیتے رہے۔ آخر فضل نے سلسلۂ کلام شروع کیا۔ "مسلمان واقعی اسی لائق ہیں۔"

اللہ دتا یکایک بولا "لیکن مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ کیا ہے؟"

گلاب خان کی آنکھیں حسبِ معمول جوش سے سُرخ ہو گئیں۔ اگرچہ شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ تاہم گلاب خاں کے چہرے کا بھورا رنگ سیاہی میں بھی نمایاں تھا۔ اُس نے رقت آمیز انداز میں کہا "سچ پوچھو، تو یہ ہمارے ایمان کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو، ہمارا کوئی عمل اسلام کے مطابق ہے؟ جھوٹ ہم بولتے ہیں، دغا کرنے سے ہم باز نہیں آتے، چوری کرنے سے ہم نہیں ٹلتے۔ شرابیں ہم پیتے ہیں، جوا مسلمان کھیلتے ہیں۔ رنڈی کا گھر مسلمان کے دم قدم سے آباد ہے۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک کوئی بھی مسلمان اسلام کا پابند ہے؟ پھر ہم خدا سے رحمت کی توقع رکھیں تو کیا یہ بے حیائی نہیں ہے؟"

اندھیرے میں گلاب خاں کی آواز لرز رہی تھی۔ اُس کی باتوں میں اثر اور درد تھا معلوم ہوتا تھا یہ باتیں اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہیں۔

فضل قصائی گلاب خاں سے ٹھٹھا مذاق کرنے کا عادی تھا۔ یکایک وہ بولا۔

"آیا بڑا مولوی، تم خود کیا کرتے ہو؟ بتاؤ تو سہی۔"

گلاب خاں نے تیزی سے جواب دیا "مَیں بھی تو انہی مسلمانوں میں سے ہوں اور تم کیا کم ہو؟"

اتنے میں مسجد کے دائیں طرف سے ایک سائیکل کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ برکت ماشکی شہر سے آ رہا تھا۔ گلاب خاں نے جلدی سے آگے بڑھ کر پوچھا "اخبار لائے؟" برکت نے ہینڈل کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے میں سے اخبار نکالا اور کہا "ظلم کی انتہا ہو گئی ہے۔ ہوشیار پور اور لدھیانہ میں لوٹ کا بازار گرم ہے مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں جلائے جا رہے ہیں۔ دودھ پیتے بچے تک قتل کئے جا رہے ہیں بھوک کے پیاسے اور بیمار مسلمانوں کا عضو عضو کاٹ کر انہیں مارا جاتا ہے۔ ان کی عورتیں چھینی جاتی ہیں۔ اور ان پر ایسے ایسے ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ جن کے تصور سے بھی روح کانپ جاتی ہے۔"

ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوا گویا تمام کائنات سناٹے میں آ گئی۔ گلاب خاں نے ضبط سے کام لیا، اور دکان کے پاس آیا۔ گنگا رام دکان میں دیئے کے سامنے اپنی بہی کھولے حساب کر رہا تھا۔ گلاب خاں نے غم و غصہ سے گھٹتی ہوئی آواز میں کہا "گنگا رام ذرا دیا لانا" گنگا رام نے گلاب کے چہرے کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ تازہ اخبار آیا ہے۔ اس نے دیا دکان کی دہلیز میں رکھ دیا۔ گلاب خاں اخبار الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اخبار سکھوں کے منظم حملوں اور پٹیالہ فوج کے ظلم و ستم کی داستانوں کی تفصیل سے پُر تھا۔

فضل قصائی نے کچھ انتظار کے بعد کہا: "خاں جی! ہمیں بھی سنائیے"

گلاب خاں نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہا: "اخبار پڑھا نہیں جاتا" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اُس کی آنکھیں دیئے کی مدھم لَو میں پُرنم دکھائی دے رہی تھیں۔ اِس کے بعد اُس نے کہا: "فضل میرا ارادہ ہے عشاء کی نماز کے بعد تمام گاؤں کو بلا کر اخبار سنایا جائے"

عشاء کی نماز سے پہلے ہی گاؤں کے چاروں گوشوں سے لوگوں کی ٹولیاں نکل نکل کر مسجد کے پرے ریت کے ٹیلے کی طرف جا رہی تھیں۔ ٹیلے پر لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ مجمع کے چاروں طرف برچھے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ اور مجمع کے درمیان ایک مدھم لالٹین کے سامنے گلاب خاں اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اس نے اس وقت عینک لگا رکھی تھی۔ یہ عینک گنگا رام کی تھی۔ جو گلاب خاں اُس سے اکثر پڑھنے کے لئے مستعار لے لیا کرتا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ سیاہی مائل کھیت دُور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور تاریک افق کے کنارے درختوں کے جُھنڈ کالی روشنائی کے دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ گلاب خاں لرزتی ہوئی آواز میں خبریں سُنا رہا تھا ظلم کے ہر واقع کی اطلاع کو وہ دہرا دہرا کر پڑھتا مجمع میں سے وقتاً فوقتاً ٹھنڈی آہ یا ہائے ہائے کی آواز بے اختیار اُٹھتی۔ اخبار کا ایک صفحہ پڑھنے کے بعد گلاب خاں کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اور اب اُس کی زبان سے لفظ اُلٹ پلٹ نکلنے لگے۔

مجمع سکوتِ غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب گلاب خاں نے اخبار پڑھنا بند کیا تو مجمع میں سے ایک مغلظ گالی ہوائی کی طرح چھوٹی۔ لوگوں میں تبصرہ و تنقید شروع ہو گئی گلاب خاں نے لالٹین اٹھالی اور تمام حاضرین کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔

"میرے خیال میں رات ہم کو تمام گاؤں کے گرد پہرہ بٹھا دینا چاہیئے۔"

کئی آوازیں اُٹھیں "ضرور! ضرور!"

اِس کے بعد گلاب خاں نے چوکیدار سے کہا "غلام محمد! دیکھو تم ہر گھر سے ایک نوجوان ہر رات لے لیا کرو۔ اور تمام گاؤں کا چکر لگایا کرو۔"

اس رات وسطی کنوئیں پر پانچ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، اور اِن پر نوجوان دراز تھے۔ ایک، ماہیا گا رہا تھا، ایک دوسرا لیٹے لیٹے ہی اُسے تال دے رہا تھا۔ اور غلام محمد، گاؤں کا چوکیدار اپنے برچھے سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔

حملہ

"پیارے دوست! ہمارے قریبی شہر میں فساد کی چنگاری بھڑک اُٹھی ہے۔ لوگ گھبراتے ہیں تو مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کا کیا بنے گا۔ اور امن کب ہو گا؟ میں چپ ہو جاتا ہوں۔ آخر میں اِن سوالوں کا کیا جواب دے سکتا ہوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے جن کو معلوم نہیں وہ چُپ ہیں اور جن کو معلوم ہے اُن کے لبوں پر بھی مہرِ خاموشی لگی ہوئی ہے۔ واقعات کی اس عظیم زد کی انتہا کیا ہے؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

چودھری منصور نے یہ خط لکھتے ہوئے کاغذ سے نظر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا

چار دنوں کی متواتر بارش کے بعد مطلع صاف ہوا تھا تو دھوپ کس قدر چمکیلی اور نکھری ہوئی تھی گویا پانی سے دُھل گئی ہو۔ اس کی کھڑکی کے سامنے بڑھے پیلو کے درخت پر ننھی ننھی چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھا اور کچھ دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہ کر کتابوں کی الماری کی طرف مڑا۔ میز پر وہ کتاب ابھی تک کھُلی پڑی تھی۔ جسے وہ کل پڑھتے پڑھتے چھوڑ گیا تھا۔ وہ کل کتنی لذّت سے اِس کتاب کو پڑھ رہا تھا۔ لیکن اُس وقت اُس کا جی کتاب کے دیکھنے کو بھی نہ چاہ رہا تھا۔ اُس نے الماری سے دو چار کتابیں نکالیں، اُن کی ورق گردانی کی، اور اُنہیں پھر وہیں رکھ دیا۔

کمرے میں اُمس سی پیدا ہو گئی تھی۔ سورج جوں جوں بلند ہو رہا تھا گرمی بڑھ رہی تھی، اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا کوئی چیز اس کی توجہ کو اپنی طرف نہ کھینچ سکی۔ اِس پر اُس نے اپنی چھڑی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

احاطے میں اُس کی تاکید کے باوجود کوئی شخص موجود نہ تھا۔ اُس نے احاطے کے وسط میں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک چھپّر کے نیچے کرم دین لنگڑا اور شہادت علی بڈھا بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں عمر کی آخری منزلوں میں پہنچ چکے تھے وہ بڑے سکون سے حقہ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے اور ان کے قریب اندھی گدھی گھر کے سامنے گھورے کے ڈھیر پر منہ مار رہی تھی۔ جب انہوں نے چودھری کو اپنی طرف آتے دیکھا تو دونوں چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کرم دین

نے بڑی محبت سے اپنے نوجوان مالک کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔

چودھری نے کہا "بیٹھو بابا بیٹھو۔ یہ تمام لوگ کہاں گئے ہیں؟"

کرم دین نے لجاجت سے کہا "چودھری جی! وہ سب کھالا صاف کرنے گئے ہیں۔ ابھی لوٹے آتے ہیں۔"

چودھری کا غصّہ قدرے فرو ہوا۔ اُس نے اپنی چھڑی گھمائی اور جانے کے لئے مڑا۔

شہادت علی نے حقّے کی نے کرم دین کی طرف پھیرتے ہوئے کہا "کیوں چودھری جی سُنا ہے سکھ حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں؟"

نوجوان چودھری نے مسکرا کر مستفسر کی طرف دیکھا "اگر وہ حملہ کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔" دن میں سینکڑوں بار اس سے یہی سوال کیا جاتا اور وہ ہر ایک کو یہی جواب دیتا۔ اُسے خُوب معلوم تھا کہ اس قسم کے جواب خوفزدہ دلوں کو سہارا دینے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

گاؤں کے چوبڑ میں ڈھور ڈنگر کلیلیں کر رہے تھے۔ اس کے پرے گنے کے کھیت اُفق تک پھیلے ہوئے تھے۔ چودھری کھیتوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف جوار کے کھیت کھڑے تھے۔ جب وہ بڑے کھالے پر پہنچا تو تمام مزارع اسے صاف کرنے میں مصروف تھے۔ چند پھاوڑے سے ریت نکال نکال کر ٹوکریوں میں بھرتے جاتے، باقی ریت کی بھری ہوئی ٹوکریاں

باہر سڑک پر پھینکتے جاتے، ان کے جسم پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ چودھری کو دیکھ کر مزارعوں نے کام چھوڑ دیا۔ ایک نے آگے بڑھ کر وہیں شیشم کے سائے میں اپنا صافہ بچھا دیا، لیکن چودھری نے اس طرف مطلقاً توجہ نہ کی اور کھالے کے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ کھالے کے کنارے کنارے نہر تک شیشم کے درختوں کا ایک سلسلہ چلا گیا تھا۔

"میری تاکید کے باوجود تم سب احاطہ خالی چھوڑ کر کیوں چلے آئے ؟"

چودھری نے اپنے چہرے پر غصّے کی مصنوعی علامتیں پیدا کر لیں۔ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی اور اُس کے باریک نتھنے ذرا سے پھولے ہوئے تھے اس سوال پر کامل خاموشی چھا گئی۔ تمام مزارع نگاہیں جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صرف نہر کے کنارے ایک اونچے درخت پر کسی پہاڑی کوّے کی بھدّی کائیں کائیں سُنائی دے رہی تھی۔

"تم لوگ واقعی اجڈ ہو، خود ہی سوچو تم اِن کھالوں اور کھیتوں کو کیا کرو گے اگر زندگی ہی باقی نہ رہی۔ بتاؤ تو اگر اس وقت گاؤں پر حملہ ہو جائے تو کیا ہو؟"

ان میں سب سے بوڑھا اور مدبّر ابراہیم مزارع تھا۔ وہ اگرچہ سیاہ فام تھا، تاہم اس سے بڑھ کر کلام کرنے کا سلیقہ کسی کو نہ تھا۔ اُس نے اپنی بھوری اور چمکیلی آنکھیں اُٹھا کر چودھری کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی بڑا چھوٹے کی طرف دیکھتا ہے۔

"اگر عرض کرنے کی اجازت ہو تو کچھ کہوں۔" ابراہیم نے کچھ اس لجاجت سے یہ الفاظ کہے کہ چودھری کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس پر دوسرے مزارعوں کی جھکی ہوئی گردنیں بھی اُٹھ گئیں۔

"عرض ہے میں نے احاطے سے نکلتے ہوئے ان سب بیوقوفوں سے کہا بھی تھا کہ صرف چند آدمی چلیں۔ باقی احاطے ہی میں رہ جائیں لیکن جب میں یہاں پہنچا تو دیکھا کہ سب کے سب موجود تھے۔ اب کی بار تو معاف کیا جائے آئندہ غلطی ہوئی تو سزا دی جائے۔"

چودھری نے باوقار سکوت کے ساتھ سب چیزوں کی طرف دیکھا اور بچھے ہوئے صافے پر بیٹھ گیا اب سورج شیشم کے بلند درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ گیا تھا اور کھیتوں میں ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ مزارعوں نے کھانے کو پوری طرح صاف کر لیا تھا۔ اور اب وہ اپنے صافوں سے اپنے چہرے پونچھ رہے تھے اور اپنی جوتیاں جھاڑ رہے تھے۔

ایکا ایکی نہر کے کنارے غبار کا ایک بگولا سا اٹھا۔ اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ سب مزارعوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ چودھری بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب غبار چھٹا تو سواروں کی صورتیں دکھائی دیں۔ وہ جنگلی لوگ تھے۔

چودھری نے ایک لڑکے سے کہا "اسماعیل ان کو بلا تو۔" لڑکا حکم پاتے ہی اُٹھ دوڑا اور سب سے اگلے سوار کی لگام تھام لی۔ اور انہیں چودھری کے پاس

لے آیا۔ یہ چار سوار تھے۔ معمولی حیثیت کے مزارع۔ اُنہوں نے نیلے تہبند باندھ رکھے تھے۔ اور اپنے چہروں کو ڈھاٹوں میں لپیٹ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے تھے۔ چودھری کو دیکھ کر وہ کچھ ڈرے۔ لیکن جب چودھری نے کہا۔ "بھائی کوئی خبر سناؤ"۔ تو وہ ڈھب سے اپنی کاٹھیوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک جو دراز قد اور جواں سال تھا۔ بولا" ہم چک نمبر ۲۵ کی طرف سے آ رہے ہیں۔ ہمیں چک نمبر ۲۵ سے پرے چک نمبر ۶۰ کو جانا تھا۔ لیکن چک نمبر ۲۵ کی رجبیا پر سکھوں کے ایک جتھے نے ہمیں لوٹا دیا۔ ہم نے کوئی مزاحمت نہ کی اور واپس چلے آئے"۔

جب چودھری اپنے مزارعوں کی معیت میں گاؤں پہنچا تو گاؤں سنسان پڑا تھا۔ اُن کے آگے چند چارے سے لدے ہوئے چھکڑے گاؤں میں داخل ہوئے چودھری نے ابراہیم سے کہا "دیکھا، یہ لوگ کتنے احمق ہیں۔ باوجود بار بار کہنے کے تمام لوگ گاؤں چھوڑ کھیتوں کو نکل گئے ہیں۔ افسوس ہے ان پر"۔

گھر پہنچا تو اُسے خوب بھوک لگ رہی تھی، وہ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ اس کے تھکے ہوئے اعضا میں، نیند آہستہ آہستہ رچنے لگی۔ اور اونگھ میں اس نے محسوس کیا گویا وہ بادلوں کی سفید چٹائی پر پھسلتا جا رہا تھا۔

اُسے نیند کا ایک جھونکا ہی آیا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ "کون ہے؟" نوجوان چودھری جھنجھلا کر اُٹھا اور کھڑکی میں سے جھانکا۔ دروازے پہ محمد علی مزارع کھڑا تھا۔ اس کی پگڑی سر سے لٹک کر گلے میں پھندا بن گئی تھی

اور وہ کھڑا کانپ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" چودھری نے نیم وا آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

چودھری کو دیکھتے ہی اُس نے ہاتھ اُٹھائے اور دُہائی دی: "چودھری جی! چک نمبر ۵۲ اور ۳۵ کو سکھوں نے ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب وہ چک نمبر ۶۷ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔" اتنا کہتے ہی وہ دوڑتا ہوا صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔

چودھری کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اور اُس نے ایسا محسوس کیا گویا اس کی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی شے رینگ رہی ہے۔ "حملہ" اُس نے آہستہ سے کہا۔ اُس کا دل کانپنے لگا۔ اتنے میں نقارے پر چوٹ پڑی اور تمام گاؤں جھنجھناہٹ سے بھر گیا۔ اس کی بندوق دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی، اور اس کے اوپر کھونٹی میں گولیوں کا وزنی تھیلا لٹک رہا تھا۔ اُس نے سوچا: "ہر چیز اور ہر کام کے لئے ایک وقت ہوتا ہے اب اس کا وقت بھی آ گیا۔"

منصور نے جلدی سے اپنی قمیص کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُس نے کمرے میں ادھر اُدھر دیکھا اسے سوائے بندوق اور گولیوں کے اور کسی شے کی حاجت نہ تھی جب وہ کمرے سے باہر نکلا، تو دو بوڑھی عورتیں اُس کی طرف تیز تیز قدم اُٹھاتی آ رہی تھیں۔ اُس کے لہنگے پھیل کر چھتریوں کے مانند ہو گئے تھے۔

"بٹیا چودھری ہمارا کیا بنے گا" ایک بوڑھی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"چھی چھی۔ بیٹا کیسی بات کر رہی ہو۔ سکھ کبھی حملہ کر بھی سکتے ہیں؟ اطمینان سے گھروں میں بیٹھی رہو۔"

چودھری انہیں پہلو کے نیچے ہائے ہائے کرتے ہوئے چھوڑ کر چلا گیا۔ احاطے میں کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تاجو کے چھپر کے نیچے چار لڑکے برچھے لئے کھڑے تھے۔ محمد علی اور احمد دین دوڑتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گئے لیکن ابراہیم کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چودھری تیزی سے احاطے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ابراہیم کی آواز آئی "چودھری جی! رُکئے!" اس کے ساتھ شمو اور لال دین تھے۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اُس نے بڑے ادب سے کہا "چودھری جی! آپ جہاں کہیں جائیے اپنے آدمیوں کو ساتھ لیتے جائیے۔"

گاؤں میں ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لوگ سڑکوں پر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ عورتیں اور بچے چھتوں پر چڑھ کر چلا رہے تھے۔ چودھری وسطی کنوئیں کی طرف بڑھا۔ کنوئیں کے سامنے گنگا رام کی دکان پر گلاب خاں پستول میں گولیاں بھر رہا تھا۔

چودھری نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا: "معاملے کا صحیح علم بھی ہوا ہے یا نہیں۔"

گلاب خاں کے بدن پر ہلکا سا رعشہ طاری تھا۔ اُس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اُس نے پستول بھر کے اپنی دھوتی کے پلو میں باندھ کر اسے اپنی

کمر میں اڑس لیا۔

"عبدالکریم نے بتایا ہے کہ چک نمبر ۶۶ سے ایک شخص آیا ہے جس نے اطلاع دی ہے کہ چک نمبر ۶۷ والوں نے مدد طلب کی ہے۔"

چودھری کو دیکھ کر دو چار مزارع اور مسجد کے میاں جی بھی آ گئے۔

"جب تک کوئی مستند اطلاع نہ ملے اُس وقت تک آپ لوگ کیوں خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں۔"

نقارہ زور سے بج رہا تھا، اور گاؤں کے چاروں گوشوں سے گیدڑوں کی سی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ جنگلی لوگوں کی مدد کی پکار رہے۔ چھکڑے کھڑکھڑاتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ گاؤں کی بیرونی سڑک پر غبار کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ اِتنے میں مسجد کے عقب سے تین سوار نمودار ہوئے۔ اُن کا دم پھولا ہوا تھا اور اُن کے چہروں سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ انہوں نے چودھری کے پاس پہنچ کر گھوڑے روک لئے اور کہا۔ "ہم چک نمبر ۶۹ سے آ رہے ہیں۔ چک نمبر ۶۷ پر واقعی حملہ ہو گیا ہے۔ اِس لئے اپنے کچھ آدمی مدد کے لئے بھیجئے۔ اب ہم چک نمبر ۷۰ کی طرف جا رہے ہیں۔"

ایک مزارع نے پوچھا۔ "بھائی لسّی پانی پیو گے؟"

"نہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے گھوڑوں کا رُخ پھیرا، اور انہیں ایڑ لگائی چند ہی لمحوں میں وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور صرف غبار باقی رہ گیا۔

اِن سواروں کے جاتے ہی گاؤں میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ آناً فاناً تمام گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ عورتوں کے بین کی آوازیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں نقارے پر چوٹ اِس قدر زور سے پڑنے لگی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ منشی کرم دین مسجد سے بھاگا بھاگا نکلا اور لوگوں کے مجمع میں آ گیا۔ وہ حسب معمول دھوتی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔

اُس نے چلاّ کر کہا "یہ کون نقارہ بجا رہا ہے۔ بند کرو اسے فوراً بند کرو۔"

تھوڑی دیر کے بعد نقارہ بند ہو گیا۔ اور اسماعیل کی بلند آواز یہ کہتے سنائی دے رہی تھی "تم نے کس کی اجازت سے نقارہ بجانا شروع کیا تھا؟"

نقارے کے بند ہوتے ہی گاؤں میں قدرے سکون ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ رفتہ رفتہ چودھری کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ وہ مختلف تجویزیں پیش کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ابھی جتھا بند ہو کر ۶۰ کی طرف چلا جائے۔ دوسرے کہہ رہے تھے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں۔ گاؤں کو یوں خالی چھوڑ کر جانا سخت حماقت ہے۔ عورتیں بھی گھروں سے نکل نکل کر کنوئیں کی جانب آ رہی تھیں۔ اُن کی کافی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ یکایک منشی کرم دین کا غصہ دبی ہوئی چنگاری کی طرح بھڑک اُٹھا۔ اور وہ باؤلے کتے کی طرح عورتوں پر جھپٹا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی تم گھر میں امن سے بیٹھ نہیں سکتیں۔"

منشی کو دیکھتے ہی عورتیں بھاگ گئیں۔

چودھری منصور خاموشی سے مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لوگوں کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ ایک اپنی بات پوری نہ کرنے پاتا کہ دوسرا بیچ میں بول اُٹھتا۔ پھر ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر بلند آواز سے بولنے کی کوشش کرتا۔ بالآخر چودھری نے ہاتھ سے سب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ "یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔"

مجمع میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ اس پر مستری نور کو غصہ آ گیا۔ "تم لوگ کیسے گنوار ہو۔ ایک بات کرے تو سب کو چپ ہو جانا چاہیئے۔"

چودھری نے اپنی تقریر پھر شروع کی۔ "گاؤں کو خالی کر کے جانا سخت حماقت ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ گاؤں کے چاروں ناکوں پر پہرہ بٹھا دیں۔ اور باقی لوگ نہایت ہوشیاری سے اپنے اپنے گھر کے آگے کھڑے ہو جائیں۔"

مستری نور نے پوچھا: "چک نمبر ۶۷ کو کتنے آدمی بھیجنے چاہئیں۔"

"میرا خیال ہے ہم فی الحال پانچ شخص گھوڑیوں پہ بھیج دیں۔ وہ چک نمبر ۶۶ پہنچیں اور وہاں سے صحیح صحیح حالات معلوم کر کے اپنے میں سے ایک شخص کو یہاں بھیج دیں۔ اگر مزید مدد کی ضرورت ہوئی تو ہم اور بھی آدمی بھیج دیں گے۔"

تین چار آوازیں بلند ہوئیں: "بالکل ٹھیک ہے۔"

"چک نمبر ۶۶ کون جائے گا؟" لوگوں میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ چودھری نے بلند آواز سے کہا۔ "۶۶ کون کون جائے گا؟"

پھر مستری نور نے بلند آواز سے کہا: "بتاؤ بھائی چک ۶۶ کون کون جائیگا؟" لوگوں نے چودھری اور مستری کی طرف دیکھا۔ لیکن پھر باتوں میں مصروف ہو گئے ایسا معلوم ہوتا تھا وہ گاؤں سے باہر قدم رکھنے سے ہچکچا رہے تھے۔

گلاب خاں جو دیر سے چپ کھڑا تھا تیزی سے بولا: "یار تم لوگ عجب احمق ہو، باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ رحیم تم تیار ہو کر جاؤ۔ اللہ دتا تم بھی جاؤ۔"

رحیم چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد سفید گھوڑی پہ سوار ہو کر آ گیا۔ اس کے ساتھ اللہ دتا بھی ہو لیا۔ اور جب وہ چک نمبر ۶۶ کی طرف چلنے کو تیار ہوئے تو ان کے ساتھ لوگوں کی ایک بھیڑ ہو لی۔

منشی کرم دین تیزی سے چلایا: "ہمارا گاؤں کتنا بے وقوف ہے۔ پہلے کوئی چلنے کو تیار نہ ہوتا تھا اور اب چلے ہیں تو سبھی ساتھ ہو لئے ہیں۔ صرف پانچ جاؤ، باقی لوٹ آؤ۔"

جانے والوں کو پیچھے سے "لوٹ آؤ، لوٹ آؤ" کی پکار سنائی دی۔ کچھ لوگ لوٹ آئے، باقی چلے ہی گئے۔

چودھری نے اپنی بندوق کندھے پر رکھ لی اور کہا: "اب پہرے بیٹھ جائیں، میں تمام گاؤں کا چکر لگاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا اور اُس کے ساتھ منشی کرم دین، مستری نور، اور محمد صدیق ٹھیکیدار کا چھوٹا بھائی ساتھ ہو لئے۔ گلاب خاں وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

گاؤں کے چاروں ناکوں پر پہرے بیٹھ گئے۔ مغربی ناکا جو چک نمبر ۶۶ اور نمبر ۷۶ کے رُخ پر واقع تھا، گاؤں کے منتخب جوانوں سے بالخصوص مضبوط بنایا گیا تھا۔ کھالے کی پلیا سے لے کر سکول تک برچھا برداروں کا ایک جمِ غفیر کھڑا تھا۔ شرقی ناکا بھی کافی پُر رونق تھا۔ یہ پکی مسجد کے ساتھ تھا۔ یہاں ایک شیشم کا درخت تھا جس کے سائے نے بہت سے پہرے داروں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہاں پہرے دار ایک پرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ جنوبی اور شمالی چوکیاں زیادہ پُر رونق نہ تھیں۔ اس جانب حملے کا امکان بھی کم تھا۔ اس لئے یہاں بلغمی اور سوداوی طبائع کے پہریدار متعین تھے۔ وہ کم گو تھے۔ اگر وہ فسادات پر گفتگو کر رہے تھے تو نہایت غیر جانبداری سے۔ ان کی بات چیت کا سب سے بڑا موضوع پانی کی بندی تھا۔ اور یہ کہ سکھوں نے نہر کو جگہ جگہ سے کاٹ دیا ہے۔ اس کے خلاف مغربی اور مشرقی محاذ اپنے جوانوں کے جوشیلے پن اور سرگرم گفتگو سے ہنگامہ خیز بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی خبروں پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ چند لوگ تو اس قدر جوش میں آ گئے کہ اپنے دشمنوں کو بے نقط سنانے لگے۔ چودھری منصور نے ہر ناکے پر صبر اور تحمل کی تلقین کی۔ وہ خبروں اور اخباروں کے نقطۂ نگاہ سے کچھ مختلف خیال ہی ظاہر کر رہا تھا۔ امن و امان کی تعلیم میں وہ ان سے الگ رائے رکھتا تھا۔ جو ہر خبر کو منتقمانہ پیرائے میں بیان کرنے کے عادی تھے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک ناکے سے دوسرے کی طرف جا رہا تھا۔ گاؤں کے گرد اگرد یہ اس کا تیسرا چکر تھا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھی

مستری نور، منشی کرم دین اور محمد صدیق تھک کر گنگا رام کی بیری کے نیچے چارپائی پر بیٹھ گئے، جہاں اُن سے قبل گلاب خاں محفل جمائے بیٹھا تھا۔ لیکن نوجوان چودھری اُسی طرح قدم اُٹھائے جا رہا تھا گویا کہ اس کے دل میں کوئی آگ سلگ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت، چمکیلے بال پریشان ہو کر اُس کی پیشانی پر گر رہے تھے، اور پسینے کی دھاریں اُس کے سر سے پھوٹ پھوٹ کر اُس کے سینے تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کا قمیص اس کے جسم کے ساتھ چپک گیا تھا، اور اُس کا تہبند بار بار اُس کی ٹانگوں میں اُلجھتا۔ اب وہ مغربی ناکے پر پہنچ گیا۔ وہ پہرہ داروں میں تکان کی علامات دیکھ رہا تھا۔ باتوں میں اب ویسی گرمی باقی نہ تھی۔ چند پہرے دار بیٹھے جماہیاں لے رہے تھے۔ وہ دیر کے گھروں کو چلے گئے ہوتے اگر وہ اپنے گاؤں کے جواں سال زمیندار کو یوں سرگرم اور پُرجوش نہ پاتے۔ اُس نے ٹیلے کے اوپر کھڑے ہو کر چک نمبر ۶۶ کی طرف دیکھا۔ کھلی سڑک کے کنارے کیکروں کی مسلسل قطار چلی گئی تھی۔ دُور ایک چھکڑا آہستہ آہستہ اُن کے گاؤں کی طرف چلا آ رہا تھا۔ دھوپ کی تیزی میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

ایک مزارع نے پوچھا: "کیوں چودھری جی چھتری لے آؤں؟"

چودھری نے انکار کر دیا: "دنیا میں ایک وقت آرام کا ہوتا ہے تو ایک وقت تکلیف کا بھی ہوتا ہے۔ ہمیں سخت کوش بننا چاہیئے۔"

مزارع جوان چودھری کی بات سُن کر دل ہی دل میں خوش ہوا۔ "چودھری جی! آپ تو باغ کے پھول ہیں، کہیں کُملا نہ جائیں۔ ہم تو جھاڑ کے کانٹے ہیں کہ جنگل

کی زمی سختی سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔"

چودھری مسکرا کر چل دیا۔ ایکا ایکی وسطی کنوئیں سے ایک لمبی دردناک چیخ سنائی دی۔ اور ایک دم تمام گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ پہرے پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ اٹھ بھاگنے کو تیار ہوئے۔ لیکن چودھری نے چلّا کر کہا: "اپنے محاذ کو مت چھوڑو، اگر ضرورت پڑی تو تمہیں بلا لیا جائے گا۔" اتنے میں گاؤں سے ایک ٹھنگنے قد کا شخص نکلا۔ اور اس نے چلّا کر کہا: "چودھری جی بھاگیئے۔ چک نمبر ۲۳، کے سکھوں نے ہلّہ بول دیا ہے۔" یہ چک مشرقی ناکے کے رُخ پر واقع تھا۔

مکانوں کی چھتوں پر عورتیں اور بچے چڑھ گئے اور زور زور سے چلّانے لگے عورتوں کے رونے اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ چودھری کے منع کرنے کے باوجود تمام پہرے دار بھاگنے لگے۔ گاؤں کے چاروں گوشوں سے لوگ مشرقی ناکے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ باوجود قوت اور ہمّت کے چودھری نے محسوس کیا گویا اس کی ٹانگیں سُن ہوتی جا رہی ہیں۔ اُس نے تھیلے کو کھول کر گولیاں نکالنی چاہیں۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں اور اُسے تھیلے کا بکسوا کھولنے میں وقت لگا۔ اس کے قریب سے لوگ دوڑتے جا رہے تھے۔ اُن کی رفتارِ قدم ظاہر کر رہی تھی کہ موت کا کوئی خوف ان کے اعصاب کو شل نہ کر رہا تھا۔ وہ ایک حیوانی ابتہاج کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ گویا وہ مدت سے اپنی جبلّتِ حرب کی تسکین کے لیے ترس رہے تھے۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اُسے ایک بڈھا نظر آیا، جو چھت پر کھڑا زور سے چلّا رہا تھا "جانے نہ پائیں۔" لوگ گھروں سے برچھے لئے مشرقی محاذ کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ایک شخص چلّایا "چودھری جی! اب کیوں آہستہ چل رہے ہو، یہی تو دوڑنے کا وقت ہے۔" اس پر چودھری نے تیز قدم اٹھائے۔ لیکن اُس نے یہ محسوس کیا کہ یہ کوشش بیکار تھی، کیونکہ اس کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ اُس کے دل میں یک لخت ایک خیال اُبھرا۔ "میرے لئے مرنا کیا ضروری ہے؟ مجھے اپنا آپ بچانا چاہیئے۔ میں دنیا میں جو کام کرنا چاہتا ہوں وہ ادھورا ہی رہ جائیگا۔ مجھے قدرت کی طرف سے جو عالی دماغ ملا ہے اُس کی کرشمہ سازیاں بے نمود ہی رہ جائیں گی؟ میرے خیال میں جو کام میں کرنا چاہتا ہوں وہ کُل نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے ہے۔ اگر میں قتل ہو گیا تو اسے کون مکمل کرے گا؟" لیکن نفسانیت کے اس جذبے پر وہ خود ہی شرما گیا۔

اس کے باوجود وسطی کنوئیں تک پہنچتے پہنچتے وہ بے دم سا ہونے لگا۔ مسجد کے قریب ایک شخص اپنا صافہ ہلا رہا تھا اور بآوازِ بلند پکار رہا تھا "کوئی خطرہ نہیں، کوئی خطرہ نہیں۔" یہ سنتے ہی اُس کے جسم میں گویا جان سی پڑ گئی اور رُکا ہوا خون پھر چلنے لگا۔ وہ تیزی سے بڑھا اور مسجد تک پہنچا۔ مسجد کے سامنے لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ چودھری کو دیکھ کر تمام لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیا معاملہ تھا؟"

اللہ بخش بولا۔ ایک سکھ یہاں سے گزرنے لگا کہ چند لڑکے اس کے پیچھے لگ گئے وہ اپنی کرپان پھینک سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ہم نے انہیں واپس بلا لیا ہے۔"

چودھری نے غصے سے پوچھا "کون کون تھا ایسا لڑکا؟"

"ایک نائی تھا اور دو ارائیں لڑکے تھے۔"

چودھری نے تیوری چڑھا کر اُن کی طرف دیکھا۔ "بے وقوفو تمہاری ایک غلطی سے لاکھوں جانیں تلف ہو سکتی ہیں۔ اب وہ اپنے گاؤں میں پہنچ کر کیا خبر سنائے گا؟ اگر یہ جگہ میدانِ جنگ بن جائے تو یہ مت سمجھو کہ یہیں خون بہے گا۔ اس خون کا رنگ تمام ملک کو اپنے رنگ میں رنگ لے گا۔ ہم یہاں ایک سکھ ماریں گے تو وہ لوگ ہمارے دس بھائی وہاں قتل کر دیں گے۔ اگر تمہیں اِن پر ترس نہیں آتا تو اپنے بھائیوں ہی پر رحم کرو۔"

مستری نور جو چودھری کی پشت پر کھڑا تھا۔ نہایت طیش سے آگے بڑھا اور نائی کو گریبان سے پکڑ کر بولا "تمہیں کس نے پردھان بنایا؟" دوسرے لوگ بھی پل پڑے۔ اور اُسے سخت سست کہنے لگے لیکن منشی کرم دین ان سب پر پل پڑا۔ "یارو تم عجیب لوگ ہو؟ جب یہ اُس سکھ کے پیچھے بھاگے تھے تو اُس وقت تم انہیں پکڑ کر روک نہیں سکتے تھے؟"

دُور کھیتوں کے درمیان ایک شخص گھوڑی پر لادی لادے آ رہا تھا۔

"وہ کون ہے؟"

سب کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک لڑکے نے کہا، "چک نمبر ۶۴ کا کھتری ہے اور شہر سے سودا سلف لئے آ رہا ہے"۔

منشی کرم دین نے اسماعیل سے کہا، "جاؤ اس سے کہو کہ بے خطر چلا آئے"۔

لڑکا اُس کی طرف لپکا۔ گھوڑی والے نے جُونہی اس ہجوم کو دیکھا اُس نے فوراً اپنی گھوڑی کا رُخ پھیر لیا، اور اُسے ایڑ پر ایڑ لگانے لگا ـــــ لیکن گھوڑی تھکی ہوئی تھی۔ وہ اَڑ گئی۔ لڑکے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کھتری نے گھوڑی سے چھلانگ لگا دی۔ اور بھاگ کھڑا ہوا۔ لڑکے نے آواز دی، "لالہ گھبراؤ نہیں چلے آؤ"۔ اس پر دو چار لڑکے اور بھی لالہ کے پیچھے بھاگے۔ مگر لالہ نے ایک نہ سنی اور سرپٹ بھاگتا گیا۔ لڑکے بھی اس کے پیچھے لگے ـــ پکارے چلے جا رہے تھے۔ لالہ ایک کھالا پھلانگنے لگا۔ کہ پاؤں رپٹ گیا اور منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ لڑکوں نے اوپر سے جا لیا اور اُسے پکڑ کر اُٹھایا۔ لالہ ہانپ رہا تھا اور بکلا رہا تھا "میں شہر گیا تھا، ہاں میں شہر گیا تھا سودا لانے"۔ لڑکے زور زور سے ہنسنے لگے۔ اور لالہ اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔

چودھری بھی موقع پر پہنچ گیا۔ اُس نے لالہ کو تسلّی دی۔ لالہ کا دم میں دم نہ آ رہا تھا۔ اُس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا، "بُرا ہو زمانے کا، آجکل ساجن بھی دشمن دکھتا ہے"۔

چودھری نے لالہ کو گھوڑی پر سوار کیا اور اُسے خود مغربی چوکی کی حد تک پہنچا کر آیا۔

مغربی چوکی کے پہرے داروں نے چودھری کے لئے دودھ کی لسی تیار کر رکھی تھی۔ وہ چودھری کی دوڑ دھوپ کو شکر اور احسان کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ مغربی چوکی پر پہنچا تو ایک مزارع نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کشاں کشاں اُس چارپائی کی طرف لے گیا جو کیکر دل کے سائے میں بچھی ہوئی تھی۔

"چودھری جی! ذرا سستا لیجئے" سب پہرے دار اس کے گرد گھیرا ڈال کر زمین پر بیٹھ گئے۔ اور چودھری لسی پینے لگا۔ چودھری نے لسی کا ایک گلاس ہی پیا تھا، کہ دور چک نمبر ۶۶ کی طرف سے دو گھڑ سوار آتے دکھائی دیئے۔ کسی نے کہا سفید گھوڑی تو رحیم کی ہے یہ دوسرا کون ہے؟"

الہ بخش نے نظر پر زور ڈال کر دیکھا "یہ حسن بلوچ نہیں؟ گھوڑا تو وہی ہے"۔

الہ بخش کا قیافہ درست نکلا۔ رحیم چودھری کو دیکھتے ہی گھوڑی سے اُتر آیا۔ "کوئی فکر کی بات نہیں۔ بالکل خیریت اور امن امان ہے۔ سکھوں نے کوئی حملہ نہیں کیا۔ چک نمبر ۲۵ کے سکھوں اور جنگلیوں کے درمیان ایک بھینس کے سودے پر تنازع ہو گیا تھا۔ لیکن چند داناؤں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔"

حسن بلوچ کا بلند قامت اور مضبوط گھوڑا زور زور سے ہنہنا رہا تھا۔ وہ اسے ایک جگہ کھڑا کرنے کے لئے باگیں کھینچ رہا تھا۔ لیکن وہ وفورِ قوت سے چک پھیریاں لینے لگا۔ حسن بلوچ ایک مضبوط اور طاقت ور جوان تھا۔ اُس کی کمر کے ساتھ پستول چرمی خول میں لٹک رہا تھا۔ اور اُس کے بائیں ہاتھ میں ایک لمبا نیزہ تھا۔ اُس نے

پہرے داروں کو خطاب کیا "شاباش جوانو! یہ کفر و اسلام کی جنگ ہے۔ اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے جانیں ہتھیلی پر لئے رہو۔"

کفر و اسلام کے الفاظ چودھری کے دل میں نرازو ہو گئے۔ وہ خاموش نگاہوں سے بلوچ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چودھری اُس کی طرف دیکھتا رہا تاآنکہ وہ گھوڑے کی ٹاپوں سے اُڑتے ہوئے غبار میں گم ہو گیا۔

چودھری گھر پہنچتے ہی بے بس ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ وہ یکایک تھکن سے اس قدر چُور ہو گیا کہ اس کو کروٹ لینا بھی گوارا نہ تھی۔ وہ کامل سکون چاہتا تھا۔ اس کی والدہ اس کے لئے دودھ کا پیالہ لائی۔ لیکن اُس نے پینے سے انکار کر دیا۔ وہ صرف سکون اور تنہائی چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ ہلکی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ باہر آسمان پر بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اور ڈوبتے سورج کی کرنیں پیلو کے پتوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ وہ دیر تک غمگین خیالات میں ڈوبا رہا۔

زندگی کے تاریک پہلو اس کے سامنے پرے باندھے آ رہے تھے۔ اور شام کے پردے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ پیلو کی سبزی سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ اور پرندوں کے غول کے غول اپنے آشیانوں کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ نوجوان مفکرؔ کے جسم کی تھکان اب میٹھے سکون میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں خیالات کی تیزی اور ہیجان قدرے کم ہوا اور اس کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ ان مسائل

کے حل کی اُمید ابھی باقی ہے مسجد سے شام کی اذان کی آواز آئی۔ چوہدری جلدی سے اُٹھا اور مسجد کی طرف چل دیا جب وہ ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہا تھا تو اُسے قرآن کی بتائی ہوئی ایک حقیقت یاد آئی۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب۔ (آگاہ رہو کہ خدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔)

انتقال

شام کے قریب الٰہ بخش نے کرتار سنگھ کو جہلم کے کنارے اپنے بال بچوں سمیت جاتے دیکھا۔ الٰہ بخش نے اپنے بیل کو رجہلم میں دھکیل دیا اور کرتار سنگھ کی طرف بڑھا۔ کرتار سنگھ نے چھکڑے کو روک لیا۔ وہ الٰہ بخش کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا اور اُس کی بیوی رونے لگی۔

الٰہ بخش نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔" مجھ سے ڈرو نہیں ہم وہی ہیں جو اکٹھے بھیڑیں چراتے تھے۔ اور خزانچی کے باغ سے مالٹے توڑتے تھے۔"

کرتار سنگھ نے اپنی قمچی ہاتھ سے رکھ دی اور اپنی پگڑی کا پلّو آنکھوں پہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ الٰہ بخش ضبط نہ کر سکا۔ اور اُس کی چیخیں نکل گئیں۔

کرتار سنگھ نے روتے ہوئے کہا:" یہ تقدیر ہے یہ موت ہے۔ کون جانتا تھا کہ ہم ہرے بھرے کھیتوں کو چھوڑ کر یوں جائیں گے۔ کون جانتا تھا کہ بچّوں کے شور و غل اور میاں بیوی کی محبّت سے منوّر گھر تج کے ہم کو جانا پڑے گا۔

ہے ٹھوکر ٹھکانے والے ہم سے پوچھ موت کیا ہے؟ ہم سے پوچھ دل پہ پتھر رکھ کے زندگی چھوڑنا کیا ہے؟"

کرتار سنگھ کی بیوی کا سر چھکڑے کے بانسوں پہ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ بے رنگ تھا۔ وہ ایسی نظر آتی تھی گویا آسیب زدہ ہے۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اُس نے الٰہ بخش کی طرف دیکھا۔ اور پھر اپنے گاؤں کی سمت میں دیکھنے لگی۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ بجھے ہوئے افق سے سیاہی کے بخارات آہستہ آہستہ ابھر رہے تھے۔ الٰہ بخش کے ڈھور ڈنگر کٹی ہوئی چری کی کھونٹیوں پر منہ مار رہے تھے۔

"بھائی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے آنا۔ اگر چاہو تو کولہو منگوا لو۔ اگر تمہیں بھینس کی ضرورت ہو تو وہ لے لو۔ ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا پچھلے مہینے خریدا تھا وہ بھی تمہاری نذر ہے۔"

کرتار سنگھ اپنی ناک جھاڑ رہا تھا۔ لیکن الٰہ بخش چپ کھڑا سرخ آنکھوں سے چھکڑے کے پہیے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا ایسے دکھی لوگوں کا مال جائز ہے؟ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!! جس مال نے ان سے وفا نہیں کی وہ کسی دوسرے سے کب وفا کرے گا؟"

بیلوں نے سر ہلائے اور گھنٹی کی ٹن ٹن نے کوچ کا پیغام سنایا۔ کرتار سنگھ نے پنجی اٹھالی اور بیلوں کو ہانکنے لگا۔ "ہماری قسمت میں لکھا تھا کہ کسی کے کرموں کا پھل ہمیں چکھنا ہے۔ اچھا رب نے چاہا تو پھر ملیں گے۔"

کرتار سنگھ کی آنکھیں پھر ڈبڈبا آئیں۔ اُس نے الہ بخش کی طرف دیکھا لیکن جلدی سے بیلوں کی طرف مڑا اور اُنہیں ٹچکارتے ہوئے ہانک دیا چھکڑے کے پہیے چرچرائے اور اُس لیک پر چلنے لگے جو اس سے پہلے گزرے ہوئے چھکڑوں کے بوجھ سے گہری ہو چکی تھی۔

بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چھکڑا اب بوڑھے کیکر کے پاس پہنچ چکا تھا۔ الہ بخش نے اپنے بیل کی طرف دیکھا جو رجبہا کے چلتے ہوئے پانی میں زور زور سے سانس لے کر پانی پی رہا تھا۔ اس کا دل غمگین تھا۔ اُس نے ایک بار پھر مڑ کر چھکڑے کی طرف دیکھا چھکڑے سے سسکیوں کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

الہ بخش نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنے بیل کو رجبہا سے نکالا جب وہ رجبہا کی پٹڑی سے نیچے اُتر رہا تھا۔ تو اُس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”کلجگ ہے میاں کلجگ“ جب وہ اپنے کھیتوں میں پہنچا تو ڈھور ڈنگر گھر کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے اپنے اس بچھڑے کو ہانکا جسے وہ پورے ایک سال سے اس اُمید پر پال رہا تھا کہ ایک دن وہ بیل بن جائے گا اور اس کے کام آئیگا لیکن وہ چلنے کی بجائے زور سے پھنکارا۔ الہ بخش کے دل میں جس قدر غم بھرا ہوا تھا۔ اسی قدر طیش بھر گیا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس پر تابڑ توڑ چھڑیاں برسانی شروع کر دیں۔ بچھڑا گھبرا کر بھاگا اور اس کے ساتھ تمام چوپائے بھاگتے ہوئے کپاس کے کھیت میں گھس گئے۔ اس نے سُرعت سے اُن کا رُخ پگڈنڈی کی طرف پھیرا جب

وہ گاؤں کے نزدیک پہنچا اور کھیتوں سے دوسرے چوپائے بھی لوٹتے دیکھے تو ایکا ایکی اس کا جی چاہا کہ کاش میں کرتار سنگھ کے ڈھور ڈنگر لے ہی لیتا۔

گدھ

علی الصباح پو پھٹنے کے قریب دو گولوں کے چھوٹنے کی آواز آئی۔ ایک گولہ اس وقت چھوٹا جب مرغ نے پہلی بانگ دی اور دوسرے گولے کی اس وقت آواز آئی جب میاں جی نے اذان دی۔ اس کے بعد کامل خاموشی رہی۔ مسجد میں مستری نور اور الہ بخش بھی آ گئے اور فتح محمد نے ڈول کنوئیں میں اتار دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر جب نمازی باہر نکلے تو چک نمبر ۸۶ کی جانب سے نورا دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ دور ہی سے اپنا صافہ ہوا میں ہلا رہا تھا۔ مستری نور گھبرا کر شیشم کے درخت سے لگ گیا۔ جو مسجد کے صدر دروازے کے عین سامنے تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور اس کا دل اس طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ گویا وہ پکار رہا ہو "حملہ حملہ، حملہ!"

غلام حسن اور ابراہیم بھی باہر نکل آئے۔ نورا اب قریب آگیا تھا۔ مستری نے ہکلاتے ہوئے پوچھا "کیوں کیوں کیا ہے؟"

"چک نمبر ۸۶ بالکل خالی ہو گیا ہے۔"

نورا کا سانس پھولا ہوا تھا۔ مگر وہ ہراساں نہ تھا۔

مستری نے پوچھا "کیا مطلب" وہ پورا معاملہ سمجھنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔

"انہوں نے گاؤں خالی کر دیا ہے۔ وہ چلے گئے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

اللہ بخش نے پوچھا "تم اس وقت کہاں تھے؟"

"میں صبح سویرے اسماعیل کے مربع میں گھاس کھودنے گیا تھا۔ کہ میں نے چھکڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سُنی۔ میں نے سمجھا سکھ حملہ کرنے آئے ہیں۔ میں نے پہلے تو ارادہ کیا کہ بھاگ جاؤں۔ پھر میں نے سوچا کہ اصل بات تو معلوم کر لوں۔ چنانچہ میں سرکنڈوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اُن کے چھکڑے ایک قافلے کی صورت میں گاؤں سے نکل رہے تھے اور وہ زار و قطار رو رہے تھے۔"

اتنا کہہ کر نُورا تیزی سے چلا گیا۔ لیکن وہ ایسی بات کہہ گیا۔ جس کو دل فوراً قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو رہے تھے۔ مستری نُور کا دل قدرے ٹھنڈا ہوا تو اس نے تھوکتے ہوئے کہا "یہ دھوکا ہے۔ سکھ گاؤں خالی کر کے کبھی جا ہی نہیں سکتے۔ یہ ایک چال ہے۔"

لیکن اللہ بخش معاملے کو راست دیکھنا پسند کرتا تھا۔ "انہوں نے گاؤں ضرور خالی کر دیا ہے۔ پرسوں کرتار سنگھ مجھے جاتے ہوئے ملا۔ اُس نے خود مجھے بتایا۔"

مستری نے تیزی سے کہا "میاں کچھ ہوش کی دوا کرو۔ کبھی یہ بھی ممکن ہے؟"

اس گفتگو میں فضل بھی شریک ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ پہلے چپ کھڑا سنتا رہا لیکن جب اُس نے مستری کی ہٹ دھرمی دیکھی تو اُس نے بھی غیر جانبداری کا دامن

چھوڑ دیا۔

"چچا تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ اس قوم کو ہمارا ملک چھوڑنا ہی تھا جس طرح انہوں نے ہمارے بھائیوں کو اُن کے گھروں سے نکالا اسی طرح وہ بھی نکالے جائیں گے۔"

مستری اس کا جواب تیزی سے دینے ہی والا تھا کہ سب کی نظریں رحمت کے چھکڑے کی طرف اُٹھ گئیں۔ جو بڑی تیزی سے اُسے بھگاتا لا رہا تھا۔ وہ بیلوں کے کولھوں میں زور زور سے قمچیاں چبھو رہا تھا۔ اور پکار رہا تھا "گاڑی چلی ہے مال لانے" اس کے پیچھے نُور گدھی پر پالان ڈالے چلا آ رہا تھا۔ وہ گدھی کو چک نمبر ۶۸ کی طرف کھینچ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے گاؤں ہی میں رہنے پر مصر تھی۔ نُور نے غصّے سے اس کی دُم مروڑی اور گویا اُسے کوک لگ گئی ہو۔ وہ نہایت پھُرتی سے چلنے لگی۔ اس کے بعد دو تین اور مزارع نمودار ہوئے اور وہ سب ۶۸ کی طرف رُخ کئے ہوئے تھے۔

"یہ عجیب تماشا ہے" مستری کا غصّہ حیرت میں ڈوب گیا۔

ایکا ایکی فضل بھی اُچھلا اور گھر کی طرف اُٹھ دوڑا۔

مستری نے زور سے پکارا "فضل، او فضل! مت جاؤ، خطا کھاؤ گے۔"

الٰہی بخش نے بھی آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف قدم اُٹھائے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگر وہ کرتار سنگھ سے گھوڑے لیتا تو کیا حرج تھا۔ اُس کا سیاہ گھوڑا کتنا خوبصورت تھا۔ اور خیال میں اُس نے اپنے تئیں سیاہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار اپنے مربع کا چکر لگاتے دیکھا۔ دل نے کہا۔ اب بھی موقع ہے۔ چک نمبر ۶۸ ضرور جانا چاہئے۔ مستری

اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اور اُس کی آواز ابھی تک سنائی دے رہی تھی: "یہ چال ہے۔ یہ چال ہے۔"

اللہ بخش گھر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ احاطے میں ہر جگہ ۴۷؁ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ احاطے میں ایک جگہ حقے کے گرد مجمع لگا تھا۔ اور کریم نائی کہہ رہا تھا: "گولے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرے قریب میرا لڑکا لیٹا ہوا تھا۔ وہ ڈر گیا۔ میری بیوی کہنے لگی۔ کمبخت سکھ کہیں حملہ تو نہیں کرنے والے۔"

صالح کھوجی نے حقے کا کش لگایا۔ اور نہایت سکون سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا: "ابھی تارے مغرب کی طرف جھکے نہیں تھے جب میری آنکھ کھلی بھینس چارپائی کے پائے کے ساتھ سینگ مار رہی تھی۔ کھٹ کھٹ سے نیند اچٹ گئی۔ میں نے اُسے کھول کر الگ کھونٹے پر باندھا۔ اس وقت رمضان چلم بھرنے کے لئے آگ سلگا رہا تھا۔ میں پھر لیٹ گیا۔ ابھی لیٹا ہی تھا کہ گولہ چلنے کی آواز آئی۔ میں نے کہا یہ کیا۔ رمضان بولا "یہ بم ہے جو مسلمانوں کو ڈرانے کے لئے پھینکا گیا ہے۔"

صالح کے پاس ایک دُبلا پتلا نوجوان بیٹھا تھا، وہ ٹھیکیدار ابراہیم کا بیٹا تھا۔ اور اُس نے مڈل تک تعلیم پائی تھی۔ اُس نے کہا: "وہ سکھ واقعی جا رہے ہیں۔ لیکن کیوں؟"

صالح نے پوچھا: "کیوں؟" "کیا تمہیں معلوم نہیں؟" لڑکے نے کہا: "وہ اپنے کرتوتوں کے خوف سے بھاگ رہے ہیں۔ جانتے ہو انہوں نے وہاں کیا کیا۔ ان کے

ادنیٰ سے ادنیٰ ہمارو دبشش سے لے کر بڑے سے بڑے افسر تک مسلمانوں کو وطن بدر کرنے پہ تلے ہوئے ہیں۔ اور وہ [illegible] منظم سازش کے [illegible] کام کر رہے ہیں۔ ان کی فوج مسلمانوں کو قتل کرنے میں پیش پیش ہے۔ اب وہ اپنے انجام کے خوف سے پہلے ہی سے بوریا بستر گول کر کے جا رہے ہیں۔ ان کو کسی نے نکالا تو نہیں۔"

اتنے میں احاطے میں رحمت کا چھکڑا داخل ہوا، اُس کا چھکڑا گندم کی بوریوں، چارپائیوں، کرسیوں اور میزوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ تمام احاطے میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگ حقّہ چھوڑ رحمت کے چھکڑے کی طرف لپکے۔

"کیا سکھ واقعی جا چکے ہیں؟"

"تمام گاؤں خالی پڑا ہے۔ گندم کی بوریوں کے انبار لگے ہیں، گڑ کے ڈھیر لگے ہیں، شکر بازاروں میں مٹی کی طرح بکھری ہوئی ہے۔ ڈھور ڈنگر کھیتوں میں آوارہ پھر رہے ہیں۔" پھر رحمت نے اپنے بھائی اللہ وتہ کو پکارا۔ اس کی بیوی اور بہن تیزی سے باہر نکلیں اور چھکڑے سے کرسیاں کھینچ کھینچ کر اتارنے لگیں۔

اس کے احاطے میں کھٹ کھٹ کی آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئیں۔ بیلوں کی گھنٹیاں ایک مسلسل شور کے ساتھ بجنے لگیں۔ اور اس کے چند لمحوں کے بعد ایک زبردست کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ چند چھکڑے احاطے سے باہر نکل رہے تھے۔

اللہ بخش بے چینی کے عالم میں اپنے گھر کے سامنے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔

اس کی بیوی رحمت کا سامان دیکھنے گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا چک نمبر ۶ میں جانا خالی از خطرہ ہے یا پُر از خطرہ۔ شاید یہ واقعی سکھوں کی چال ہو۔ وہ گاؤں سے نکل کر قریب کے کھیتوں میں چھپ گئے ہوں کہ جونہی مسلمان آئیں اُن کا قلع قمع کر دیں لیکن چھکڑوں کی کھٹا کھٹ اُس کے دل پر ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ اس کے پاؤں گھر کے آنگن میں گڑے ہوئے تھے۔ لیکن اُس کا تخیل چک نمبر ۶ کی گلیوں میں گندم کی بوریوں اور گڑ شکر کے ڈھیروں کو روندتا ہوا جا رہا تھا۔ اتنے میں اُس کی بیوی بھی آ گئی۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے اور خشک تھے۔ وہ بہت گندی عورت تھی۔

"تم نہیں جاؤ گے؟"

بیوی کے اس سوال سے اس کا دل مردانگی سے بھر گیا۔ اُس نے سوچا مجھے ضرور جانا چاہئے۔ گھر میں گندم کی آخری بوری ختم ہونے کے قریب ہے۔ اگر میں آج نہ گیا تو کل کو گندم کہاں سے آئے گی؟ ہم غریبوں کی امیدوں کا آخری سہارا گنگا رام بھی سدھار چکا ہے۔ اب میں کس کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہوں۔

اس کی بیوی چیخی "تم تو سدا سوچ ہی میں ڈوبے رہو گے۔ اچھا بیٹھے رہو لو میں جا رہی ہوں۔"

اللہ بخش کا سویا ہوا غصّہ جاگ اُٹھا۔ وہ زور سے چلّایا "چڑیل کہیں کی مت جا۔"

"کیوں اور یہاں بیٹھ کر تمہارا منہ دیکھوں میں جا رہی ہوں"۔

"بیوقوف، یہ بھی سکھوں کی ایک چال ہے۔ وہ اکھ کے کھیتوں میں چھپے بیٹھے ہیں، اور موقع پا کر نکل آئیں گے"۔

لیکن اس نے الٰہ بخش کے غصّے کو کوئی وقعت نہ دی اور اندر چلی گئی۔ پھر الٰہ بخش کے دل میں خیال آیا۔ رحمت اتنا سامان لے کر آرہا تھا۔ مگر اُسے تو راہ میں ٹوکنے والا کوئی نہیں ملا۔ اس کے بعد اُس نے اپنا حقہ اُٹھا لیا۔ اور گاؤں کے چوک کی طرف چل دیا۔

چوک میں گنگا رام کی اُجڑی ہوئی دکان کے سامنے چارپائیوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے چودھری منصور ان کے درمیان ایک بڑی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے چوک سے گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ گلاب خاں بھی موجود تھا۔ وہ بھی گاؤں کا سربرآوردہ شخص تھا۔

اس مجلس میں بھی وہی گفتگو ہو رہی تھی۔ لوگ قدرتی طور پر چودھری کے خیالات معلوم کرنے کے خواہاں تھے۔ کیونکہ وہ گاؤں کا چودھری بھی تھا اور نیک آدمی بھی چودھری نے ہلکی سی آہ بھری اور کہا "بھائیو تم ہی بتاؤ یہ کیس جا رہے ہے؟ ایک طرف تمہارے بھائی خون کی ندیوں میں نہا رہے ہیں۔ وہاں قیامت برپا ہے اور دوسری طرف تم ہو کہ تمہیں لوٹ مار کی سوجھ رہی ہے۔ افسوس تمہیں قیامت کا خوف نہیں۔ تم جانتے نہیں کہ دُنیا فانی ہے اور دُنیا کا مال بالآخر دُنیا ہی میں رہ

رہ جائے گا۔"

منشی کرم دین نے حقّے کا کش لگایا اور کہا "در اصل بات یہ ہے کہ ہمارا گاؤں سخت گندا ہے۔ اگر گاؤں کے سب لوگ چودھری کی بات مان لیں تو ایک بہت بڑے گناہ سے بچ جائیں۔"

چودھری نے پھر کہا "یہ حق اصل میں اُن پناہ گزینوں کا ہے۔ جنہیں یوں بے یار و مددگار گھروں سے نکالا گیا ہے۔ یہ خالی شدہ گاؤں حکومت کا حق ہیں۔ ملٹری کو چاہیئے تھا کہ وہ فوراً آ کر ان پر قبضہ کر لیتی یا ان کی حفاظت کا کوئی اور بندوبست حکومت کی طرف سے کر دیا جاتا، اور ان میں آنے والے پناہ گزینوں کو درجہ بدرجہ بسا دیا جاتا۔"

اب ڈھور ڈنگر جوق در جوق گزرنا شروع ہو گئے۔ بے پناہ گرد و غبار فضا پر محیط ہو گیا۔ گلاب خاں نے کھانستے ہوئے بہت طیش سے کہا "یہ انسانوں کا کام ہے؟ یہ لوگ تو گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔" وہ پھر کھنکارا "مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ نالائق کے بچے اتنے جانوروں کو لے کر کیا کریں گے؟" پھر اُس نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا "بھائیو خوب یاد رکھو، خدا بھی سر پر ہے! اگر تمہارے یہی اعمال ہیں تو فصل خریف کا اللہ بیلی۔"

الٰہ بخش نے دل میں سوچا۔ چودھری نے بالکل سچ کہا ہے، یہ سب ڈکیتی ہے بلکہ یہ لوٹنے والے مُردار خور گدھ ہیں۔ مگر اس کے دل میں بھی سخت ہیجان برپا

تھا۔ بالآخر اُٹھ کھڑا ہوا، بازار کے سرے پر وہ مزارع نظر آئے۔ اُس نے قصداً ان کو روک لیا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ رائے عامہ ۶۸ء جانے کے حق میں ہے یا اس کے خلاف۔ اُنہوں نے اُسے تازہ ترین خبر سنائی کہ سورنا عیسائی ۶۸ء سے بھاگا بھاگا آیا ہے اور اُس نے بتایا ہے کہ ملٹری گاؤں میں قبضہ کرنے کیلئے پہنچ گئی ہے۔ اس خبر نے گویا اُس کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا "میں نے اچھا کیا جو اُن بے وقوفوں کے ساتھ نہیں گیا"۔

لیکن جب وہ احاطے میں پہنچا تو بچے کھچے لوگ بھی ۶۸ء جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ الٰہ بخش چلایا۔ "او بھتیرہ، او کریم ۶۸ء مت جائیو۔ ملٹری پہنچ گئی ہے"۔ کریم نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اور اپنا چھکڑا درست کرنے میں پھر مصروف ہو گیا۔

بھنتو بولا۔ "یہ جھوٹی بات ہے۔ ملٹری ولٹری کوئی نہیں پہنچی۔ یہ خبر اُن لوگوں نے اڑائی ہے جو سب سے پہلے ۶۸ء پہنچے ہیں۔ تاکہ دوسرے لوگ اپنا حصہ نہ لیں۔"

الٰہ بخش کے دل کی اندرونی کش مکش اُسی شدت سے پھر شروع ہو گئی جب وہ گھر پہنچا تو دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ بند دروازہ بتا رہا تھا کہ گھر کی مالکہ ۶۸ء چلی گئی ہے۔ وہ چھپر کے نیچے چارپائی پہ بیٹھ گیا اور بجھے ہوئے حقے کے کش لگانے لگا۔ وہ کش لگا رہا تھا اور بیلوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو کھٹی ہوئی چری

کھا رہے تھے۔ اُس کا لاڈلا بچھڑا ابھی چارے پر منہ مار رہا تھا۔ اس وقت سارا احاطہ چھکڑوں سے خالی ہو چکا تھا۔ صرف اسی کا چھکڑا کھڑا تھا۔ وہ یکایک اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ ناچار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مکھیاں بھنبھناتی ہوئی اسکے چہرے کے گرد چکر لگاتیں اور وہ جھلّا کر اُن پہ ہاتھ سے وار کرتا۔

باہر پھر چھکڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ ایکا ایکی مال اسباب اور گندم کی بوریوں سے لدے ہوئے چھکڑے احاطے میں داخل ہونے لگے تھے۔ مزدور لپک کر اُن کی طرف بڑھیں اور دھڑا دھڑ اسباب چھکڑوں سے اُترنے لگا۔

جب چھکڑے خالی ہو چکے تو گاڑی بان لسّی پینے لگے۔ اُن کے چہرے پسینے سے بھیگ رہے تھے۔ وہ لسّی کا ایک گلاس چڑھا لیتے اور چہرے سے پسینہ پونچھ لیتے۔ الٰہ بخش کے قدم خود بخود اپنے چھکڑے کی طرف اُٹھ گئے۔ اُس نے چھکڑے کو لکڑی کا سہارا دے کر کھڑا کیا، اور اُس کا ایک پہیّا اتار کر اُس کے دُھرے کو تیل اور صابن کے آمیزے سے چکنا کیا۔ پھر اُس نے پہیّا دُھرے میں لگا کر زور سے اُسے گھمایا۔ پہیّا پھرکی کی طرح گھومنے لگا۔ پھر اُس نے دُوسرا پہیّا اُتارا اور دُھرے کے اس سرے پر بھی یہی آمیزہ لگایا۔ جب چھکڑا بالکل تیار ہو گیا تو اس نے گاڑیبانوں کی طرف دیکھا، وہ بھی تیار تھے۔ جونہی احاطے سے باہر کے چھکڑوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز کان میں پڑی، سارے گاڑیبان اُچھل کر چھکڑوں پہ بیٹھ گئے۔ الٰہ بخش نے بھی یکایک بیلوں کو غیر معمولی قوّت سے چھکڑے کی طرف دھکیلا

اور اُن کی گردنوں پر جوا رکھ اُچھل کر خود بھی چھکڑے پر سوار ہو گیا۔

چھکڑے ایک قطار میں گاؤں سے نکل رہے تھے۔ اِس قافلے میں مستری نُور کا بیٹا بھی شریک تھا۔ اور گلاب خاں کا بھائی بھی! ؂

ایک قوم پرست کا خواب

"آج ج —— میں قتلِ عام ہو رہا ہے۔ خنجر زدہ لاشیں سڑکوں پر بکھری پڑی ہیں! کوئی اُن کا پُرسانِ حال نہیں۔ ج —— کے مشرقی حصّے میں چھ مقامات پر آتش زنی کے واقعات ہوئے۔ ایک مقام پہ آگ اِس قدر بھڑکی کہ قریبی محلہ تمام کا تمام اس کی لپیٹ میں آگیا۔ آتش گرفتہ مکانوں سے عورتیں، بچّے اور بوڑھے دوڑ دوڑ کر نکل رہے تھے۔ وہ مدد کے لئے پکارتے لیکن کوئی جواب نہ دیتا۔

"شام کو ل —— اسٹیشن کے قریب گاڑی روک لی گئی اور بلوائیوں کی ایک ٹولی نے حریف قوم کے آدمیوں کو چُن چُن کر مار دیا۔"

اِس قدر وحشی پن اور بربریت! میرا دل خوف و ہراس سے کانپنے لگا۔ میں اپنے مکان کے باہر چبوترے پہ بیٹھا گذشتہ دو دنوں کے اخبار دیکھ رہا تھا۔ سڑک کے پرلی

جانب میدان تھا جس میں خالی چھکڑے قطار در قطار کھڑے تھے۔ بیل ان کے جوؤں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور کوئی شخص بھی ان کا نگران نہ تھا۔ میں نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا چھکڑوں والے چھکڑے بیل چھوڑ کر یک بیک کہیں بھاگ گئے ہیں۔ بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹ کے اندر ایک کھٹ کھٹ ایسی سنائی دے رہی تھی۔ گویا ان سنہری گھنٹیوں میں ایک گھنٹی نہایت گھٹیا ہے وہ پیتل کی بجائے بُرے بُرے لوہے کے کسی پترے سے توڑ موڑ کر بنائی گئی ہے۔ جونہی تمام گھنٹیوں کی ٹن ٹن ایک سریلی گونج کے ساتھ ختم ہوتی اس کے عین متصل یہ موٹی اور بھدّی کھٹ کھٹ ایک ہتھوڑے کی طرح گرتی اور گونج کا گلا گھونٹ دیتی اور خاموشی پھر تن جاتی۔

۲

یکایک سڑک پر ایک جنازہ نظر آیا۔ وہ سیدھا میری طرف ہی آرہا تھا جنازے کے پیچھے لوگ نہایت خاموشی سے سر جھکائے چلے آرہے تھے۔ جب وہ میرے نزدیک پہنچے تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک مریض کو اُٹھائے لا رہے ہیں۔ میں نے خوشی سے اپنے بھائی ڈاکٹر کو آواز دی جو کچھ دنوں سے میرے ہاں مہمان تھے، اور مریضوں کے قحط کی شکایت کر رہے تھے۔ انہوں نے چارپائی میرے سامنے رکھ دی اور مریض کے چہرے سے کپڑا اٹھا دیا۔ مریض مرچکا تھا لیکن اس کی آنکھیں بدستور کھلی تھیں۔ جب میں نے جھک کر اُسے دیکھنا چاہا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا اس کی

سیاہ پتھریلی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ میں اُسے دیکھنے کے لئے جس جانب جھکتا اُس کی آنکھیں میرے تعاقب میں مڑ جاتیں۔

میں اُسے پہچان گیا۔ وہ سیاہ فام معلتی تھا۔ اُس کا اندھا باپ چار برس ہوئے ہمارے گاؤں میں تلاشِ رزق میں آیا تھا۔ وہ بہت ہی مفلس تھا۔ یہ لڑکا کام کاج کرنے کی بجائے سارا دن کھیتوں میں مٹیالے رنگ کی شکاری کتیا لئے خرگوشوں کی تلاش میں گھومتا رہتا۔ پھر اس کے متعلق سنا گیا کہ وہ دراصل خرگوشوں کا شکار نہیں کرتا، بلکہ بازی گروں کی ایک لڑکی کے تعاقب میں پھرتا ہے۔ اس کا بوڑھا باپ روتا ہوا نمبردار کے پاس گیا اور اس کے پاؤں میں اپنی پگڑی ڈال کر کہنے لگا:" وہ آپ ہی کا بچہ ہے۔ اُسے خدا ڈانٹ دیجئے وہ بہت آوارہ ہوتا جا رہا ہے۔" اور پیشتر اس کے کہ نمبردار اسے بلا کر تنبیہ کرتا وہ اپنی کتیا سمیت گھر سے غائب تھا دو دن کے بعد دوپہر کے وقت کتیا اُس کے اندھے باپ کے پاؤں چاٹ رہی تھی اور وہ اپنی کٹیا کے سامنے ایک جھلنگے پر بیٹھا رو رہا تھا۔ اور اس واقعہ کے پانچ ماہ بعد ایک میلی کچیلی چٹھی لئے اس کا باپ میرے پاس آیا۔ اور مجھے چٹھی پڑھنے کو دی۔ یہ چٹھی اس کے لڑکے نے بھیجی تھی۔ وہ فوج میں بھرتی ہو کر جبل پور پہنچ گیا تھا۔

" لیکن اسے ہوا کیا؟"

ایک کسان نے آگے بڑھ کر لاش کی ٹانگوں پر سے کپڑا ہٹا دیا۔" یہ دیکھئے کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تو گویا فساد کی خون آشام لہریں یہاں بھی پہنچ گئیں ؟ میں نے دیکھا اس کی ٹانگیں پاؤں کے بغیر تھیں۔ قتل کرنے والے نے کس بے رحمی سے قتل کیا تھا۔ اس نے اس کے پاؤں ٹخنوں کے اوپر سے کاٹ دیئے تھے۔ اب صرف ایک سفید ہڈی بکری کے کھروں کی طرح نکلی نظر آ رہی تھی۔

میں یہ ہیبت ناک منظر دیکھ نہ سکتا تھا۔ روحانی کرب کی شدّت سے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُف میرے اللہ قتل کرنے والی قوم کتنی ظالم ہے۔ اللہ انہیں تباہ کر! اللہ انہیں برباد کر! اور درد و اضطراب میرے ریشے ریشے میں رچ گیا۔

۳

میں الم کے جہنّم میں لٹکا ہوا تھا لیکن تھوڑے ہی وقفہ کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ درد کا بحران کچھ کم ہو گیا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ میں نہر کے کنارے جا رہا ہوں۔ چاروں جانب قبر کی سی گہری خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ نہر کے دونوں طرف جنڈ اور کیکر کی گھنی جھاڑیاں دشمن کی کمین گاہوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میرے دل میں موہوم خوف لرزنے لگا۔ میں نے سوچا اگر اس تنہائی میں کوئی حملہ آور مجھے دیکھ پائے اور اس بے بسی کے عالم میں مجھے بے یار و مددگار دیکھ کر میرے پاؤں کاٹ ڈالے تو ـــــ" میں اتنا سوچنے ہی پایا تھا کہ دفعتہً جھاڑی سے ایک ہیبت ناک صورت نکلی اور مجھ پر جھپٹی۔ اس کی داڑھی کے بال خارپشت

کے نوکیلے بالوں کی طرح کھڑے تھے۔ اور اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ پلک جھپکنے میں اس نے مجھے چت گرا لیا۔ اور میرے پاؤں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس کے بعد کھٹ کی ایسی آواز آئی جیسے گوشت کی دوکان پر قصائی کا وزنی چھرا تختے پر گرتا ہے۔

۴

میرے پاؤں کٹ چکے ہیں۔ میں پیلو کے درخت کے نیچے لیٹا ہوا ہوں۔ میں سرہانے سے سر اٹھا کر اپنی کٹی ہوئی ٹانگوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ میری ٹانگیں شاید بکری کے کھروں کی مانند رہ گئی ہیں یا مرغ کے کٹے ہوئے پنجے کی طرح۔ میں نے درخت کی طرف دیکھا اور دل میں کہا "میرے پاؤں کا کیا قصور تھا جو انہیں کاٹ دیا گیا۔" لیکن اس احساس نے میرے دل میں درد کی گہری چبھن پیدا کر دی۔ جب میں نے سوچا کہ اب میں بے پا ہوں۔ میرا مضطرب تخیّل اپنے کٹے ہوئے پاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ جو قاتل نے نہر کے کنارے پھینک دیے تھے۔ وہ چیلیں آسمان پر منڈلا رہی تھیں۔ ایک گدھ شیشم کی شاخِ بلند سے اترا اور میرے ایک پاؤں میں اپنی چونچ گاڑ کر یوں کھینچنے لگا جیسے کوئی انجان سوئی کے ناکے سے دھاگا کھینچ رہا ہو۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں نے آہ بھر کر کہا "مجھے کس جرم کی پاداش میں یہ سزا ملی؟"

پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان کی پہنائی کسی نور سے روشن ہو گئی ہے اور

اس کے اندر سفید بادل کا ایک ٹکڑا آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا ہے۔ تمام فضا یزدانی نغموں سے معمور ہو گئی۔ میں نے دل میں کہا: "بادل کے اس ٹکڑے پر کون سوار ہے؟" بادل کا ٹکڑا پھسلتا ہوا میرے سامنے آکر رک گیا۔ پھر اس میں سے دو فرشتے اترے جن کے بڑے بڑے پر سفید کبوتر کے پر دل سے مشابہ تھے۔ وہ ایک ڈھکا ہوا طشت لئے میرے روبرو کھڑے ہو گئے۔

"یہ تحفہ ہے تمہارے لئے اس درد کے عوض جو قوم کی خاطر تمہارے دل میں پیدا ہوا تھا۔"

انہوں نے طشت سے خوان پوش ہٹا دیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے نیچے طلائی جوتوں کا ایک جوڑا رکھا ہوا تھا جس کے نقش و نگار میں سرخ موتی جگمگا رہے تھے۔

میں جھلا اٹھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے میرے دل میں برچھے کی انی چبھو دی ہے ـــــ "میرے پاؤں تو کٹ گئے ہیں۔"

وہ گویا بہرے تھے۔ انہوں نے اپنی بات پھر دہرائی: "یہ تمہارے قومی درد کا صلہ ہے۔" میں نے چلا کر کہا۔ "لے جاؤ اسے میرے پاؤں کٹ گئے ہیں۔" لیکن وہ بدستور کھڑے رہے اور جب وہ بولے تو مجھے ایسا سنائی دیا گویا کل کائنات، کل دنیا اپنی لاتعداد زبانوں سے کہہ رہی ہے: "یہ ہے تمہارے قومی درد کا صلہ! یہ ہے تمہارے قومی درد کا صلہ!!"

فضل کریم

رات کے پروے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔

فضل کریم نے چادر میں اپنے چہرے کو لپیٹتے ہوئے کہا۔"میری گھوڑی کا کیا حشر ہؤا ہوگا"

اس کے قریب ایک لمبی مونچھوں والا شخص بیٹھا بان بٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال غیر نمایاں تھے۔ کیونکہ وہ دیئے کی روشنی سے دور بیٹھا ہؤا تھا۔ اس نے اپنی دائیں ٹانگ پھیلا دی۔ اور پاؤں کے انگوٹھے پہ بان کو چڑھا کر بٹنے لگا۔ وہ چپ اپنے کام میں محو رہا، گویا کہ اس نے کوئی بات سنی ہی نہیں۔

"بابو" فضل کریم نے پھر پکارا۔"میری گھوڑی کا کیا حشر ہؤا ہوگا؟"

لیکن بابو نے کوئی جواب نہ دیا جھکڑے کے جوئے کے ساتھ بیل بندھے ہوئے

تھے اور وہ ایک ٹوٹے ہوئے ٹین کے صندوق میں چارہ کھا رہے تھے۔ فضل کریم کی بیوی زینب رجبہا کے کنارے اینٹوں کے بنے ہوئے چولھے پر چھپ چھپ روٹیاں پکا رہی تھی۔ رجبہا کے کنارے دور تک چولھے روشن تھے اور چھکڑے قطار در قطار کھڑے تھے۔ رجبہا پر بیٹھا کوئی برتن مانجھ رہا تھا اور کوئی پانی بھر رہا تھا فضا گھٹی ہوئی انسانی آوازوں سے معمور تھی۔

فضل کریم نے چادر کا پلو چہرے سے ہٹا کر دیکھا۔ وہ رجبہا کی طرف پشت کئے لیٹا ہوا تھا۔ دور سیاہ کھیتوں کی مینڈھوں پر درخت جنوں کی طرح کھڑے تھے۔ فضل کریم نے سوچا۔ اگر یہ درخت ان کے قافلے پر حملہ بول دیں تو وہ کیونکر بھاگ سکے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر اپنی نبض ٹٹولی۔ اس نے محسوس کیا اس کی قوت جواب دے رہی ہے۔ اس کے لئے اپنا سر اٹھانا بھی دوبھر ہو گیا تھا۔

"بابو" فضل کریم نے پھر پکارا "قافلے کا پہرہ مضبوط ہے؟ مجھے خوف ہے کہیں حملہ نہ ہو جائے۔"

بابو نے پان کو انگوٹھے پر سے اتارا اور ایک لمبا سانس لیا۔

"نہیں، وہ حملہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں خوب معلوم ہے وہ بزدل ہیں۔"

فضل کریم بیس گھماؤں زمین کا مالک اور بابو ایک سو دس گھماؤں کا منشی؛ بایں ہمہ وہ ہمیشہ اس خود اعتمادی کے ساتھ بات کرتا۔ گویا کہ وہ سارے گاؤں کا واحد مالک ہے۔ فضل کریم جھلا اٹھا۔ اس نے دل میں کہا: "یہ لمبی مونچھوں والا منشی ہمیشہ

بکواس کرتا ہے ہمیں دشمن کی قوت کا کم اندازہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیا عجب جو وہ ان مہیب درختوں کے پیچھے ہی چھپے بیٹھے ہوں۔ ہر بات ممکن ہے۔ ہمارا گھروں کو چھوڑ کر نکلنا ممکن ہو گیا ہے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں"

فضل کریم دیر تک ایسی باتیں سوچتا رہا۔ اس کا فکر پہرے اور اسلحہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر ایکا ایکی اس کے تصور کے سامنے بھٹی کی تصویر کھڑی ہو گئی۔ مستری شاہ دین بھٹی کے سامنے بیٹھا ہوا ہے اور اُس کے عقب میں عبداللہ چکر گھما رہا ہے۔ مستری شاہ دین بھٹی کی طرف رخ کئے بیٹھا تھا۔ چند منٹوں کے بعد اس نے بھٹی سے لوہا نکالا اور اسے اہرن پر رکھ دیا۔ مستری کا چہرہ لوہے کی مانند سرخ ہو رہا تھا۔ اور اسکی آنکھوں کے کناروں پر جمی ہوئی چیپڑ پگھل رہی تھی۔ عبداللہ سرعت سے اُٹھا اور اپنا ہتھوڑا پکڑ کر لوہے پر ضربیں لگانے لگا — کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ۔ کچھ دیر کے لئے ساری دنیا کا شور ہتھوڑے کی کھٹ کھٹ میں دب گیا۔ جب وہ تھما تو باہر سے چکی کی گھمر سنائی دی۔ ولی محمد ڈھور ڈنگروں کو جوہڑ کی طرف ہانکے لئے جا رہا تھا جوہڑ کے پانی میں سُورج کی کرنیں کانپ رہی تھیں۔ طلائی کرنوں کا ایک جگمگاتا ہوا راستہ بنا ہوا تھا۔ جس پر نقرئی بطخیں چھپ چھپ پاؤں مارتی ہوئی جا رہی تھیں۔

فضل کریم ہنسا۔ "طلائی کرنوں کے ساتھ نقرئی بطخوں کا بھی خوب جوڑ ہے"۔

پھر اُس نے دیکھا جوار کے لہلہاتے کھیتوں کے درمیان ولی محمد اور عبداللہ چھکڑے پر چڑھے جا رہے تھے۔ بیلوں کی ایک مضبوط جوٹ چھکڑے کے آگے

جتی ہوئی تھی۔ ان کی گھنٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں فضل کریم نے اُنہیں پکارا مگر انھوں نے چھکڑا نہیں روکا۔ اتنے میں پیچھے سے نور گھوڑا سرپٹ دوڑاتا آیا۔ فضل کریم اچھل کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا تیزی سے اُڑا جا رہا تھا۔ اور اُسے لگا محسوس ہوا گویا وہ خوبصورت کھیتوں سے بلند ہو گئے تھے۔ شبنم آلودہ ہوائیں سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی گذر رہی تھیں اور گھنٹیوں کی نقرئی جھنکار سنہری دھوپ میں جھلملا رہی تھی اس کے سامنے گاؤں کی مکمل تصویر کھڑی تھی۔ کچے کوٹھوں کی چھتوں کے اوپر مسجد کے بلند مینار اور رحکی کی خواب آلود گھمر گھمر۔

"ہوشیار" تیر کی طرح چبھتی ہوئی ایک آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ پھر اس نے کھٹ پٹ کی آوازیں سنیں۔ بیلوں کی گھنٹیاں ایک ٹنٹناہٹ کے ساتھ گونج اُٹھیں۔ اور چند چھکڑے کھڑکھڑاتے ہوئے چلنے لگے۔

"کیا روانگی کا وقت آ گیا؟"

اس کی بیوی جو بیلوں کو ایک طرف دھکیل رہی تھی بولی "تارے مشرق کی طرف جھک گئے ہیں۔"

"خدا ہمارا حامی و ناصر ہو۔" فضل کریم بڑبڑایا۔ وہ لدے ہوئے چھکڑے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ کو اس طرح بڑھایا گویا کہ وہ گھر کے کسی کمرے میں لیٹا ہوا تھا اور پانی کے گلاس کو میز سے اٹھانا چاہتا ہے۔

فضا تاریک تھی۔ چولھوں کی آگ بجھ رہی تھی۔ جب چھکڑوں کے پہیے اٹکے

اوپر سے گذرتے تو راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں پھلجھڑی کی طرح روشن ہو جاتیں۔

۲

رات کی سیاہی میں صبح کی سفیدی ایک لمبے بازو کی طرح نمودار ہوئی۔ یہ بازو پھیل کر ایک بہت بڑے دیو کا پنجہ بن گیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ایک چادر کی صورت میں تمام آسمان پر پھیل گیا۔ فضل کریم کے آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے منہ کے سامنے بلند شیشم کی چوٹیاں آتیں اور گذر جاتیں۔ چھکڑے کے ہچکولوں سے اس کی ہڈیاں دکھنے لگیں۔ بیلوں کو ہانکنے اور ڈنگروں کو ٹٹکارنے کی آوازیں اس کے چاروں طرف غبارِ راہ کی طرح اُٹھ رہی تھیں۔

سُورج ذرا بلند ہوا تو اُن کا قافلہ رُک گیا۔ فضل کریم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دور تک چھکڑوں کی قطار پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے آخر میں غبار کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ پگڈنڈی ایک بلند سطح نہر کے قدموں میں جا کر ختم ہو گئی اور اب قافلے کو نہر کا پل عبور کر کے دوسری طرف جانا تھا۔ لیکن نہر کو عبور کرنا آسان کام نہ تھا۔ نہر کی پٹڑی پگڈنڈی کی سطح سے بہت بلند تھی۔ اور جب تک وہ پٹڑی پگڈنڈی کی سطح تک پست نہ کی جائے اس وقت تک چھکڑے اوپر نہیں چڑھ سکتے۔ ایک گھوڑ سوار جو قافلے کے اگلے سرے پر کھڑا تھا مڑا اور زور سے چلایا۔ ”پھاوڑے والے آجائیں۔“

اس نے ہلکے آسمانی رنگ کا قمیص پہنا ہوا تھا۔ اور اس کے سر پر عنابی رنگ کی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بلند و مضبوط تھا۔ اس کی چھوٹی مونچھیں، پتلی ناک اور

سُرخ و سفید بھرا ہوا چہرہ اس کی سپاہیانہ طبیعت کی غمازی کر رہا تھا جتنی دیر تک پھاوڑے والے کام کرتے رہے وہ گھوڑے پر بیٹھا متواتر ادھر اُدھر نگرانی کرتا رہا اور ہدایات دیتا رہا۔

"یہ کون ہے؟" فضل کریم نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں اُسے دیکھ کر سیر ہو رہی تھیں اور اس کا دل مسرور ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا گویا کہ وہ فضل کریم ہی تھا جو اس شان سے بیٹھا ہوا تھا لیکن کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اُس نے خود ہی سوچ لیا کہ وہ کوٹ جھنڈ کا نمبردار ہے۔

آدمی چیونٹیوں کی طرح کام کر رہے تھے آن کی آن میں پگڈنڈی پٹڑی کی سطح کے قریب آگئی۔ اب پگڈنڈی سے پٹڑی تک ایک ڈھلوان راستہ بن گیا تھا تجربتاً انہوں نے ایک چھکڑے کو گذارا اور وہ گذر گیا۔ اس کے بعد قافلے نے حرکت کی اور بیلوں کو للکارنے اور ڈنگروں کو ہانکنے کی آوازیں ایک شور کے ساتھ بلند ہو گئیں۔ چھکڑے والے چڑھائی پر چڑھتے ہوئے بیلوں کو موٹی موٹی گالیاں سناتے ان کے کولھوں میں ممچیاں چبھوتے، اور اُن کی دمیں مروڑتے جب بیل پل عبور کر لیتے تو وہ اس طرح ہانپنے لگتے گویا کہ ان کے اندر کوئی دھونکنی لگی ہو لیکن کمزور بیل ڈھلوان ہی پر گر جاتے اور قافلہ رک جاتا۔ دو آدمی پکڑ کر اُسے دم سے اٹھاتے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ پھر اُسے چھکڑے سے الگ کیا جاتا اور مضبوط بیل جوت کر چھکڑا پل سے گذرا جاتا۔ لیکن ایسا بھی ہوا کہ کسی کا بیل گر گیا اور کسی دوسرے نے اسے بیل نہ دیا تو

اسے دو چار بھائیوں کی مدد سے چھکڑا دھکیل کر کھینچنا پڑا۔

پانی کو دیکھ کر اکثر بھینسیں رجھا میں کود پڑیں۔ اور ان کے والیوں کو ان کے پیچھے پانی میں اُترنا پڑا۔ نہر کے پرلی طرف چند سکھ لڑکے کھڑے تھے۔ وہ غالباً کاشتکار تھے جو کام چھوڑ کر یہ تماشا دیکھنے آ گئے۔ کچھ تو کھیتوں ہی میں کھڑے رہے اور کچھ جو اپنے دل کی مضبوطی دکھانا چاہتے تھے۔ نہر کے کنارے آن کھڑے ہوئے۔ ان کے پاس لٹھوں کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا۔ جب قافلے کا بیشتر حصہ پل عبور کر چکا تو یکایک پچھلی قطار سے ہنگامہ برپا ہوا۔ "پکڑیو۔ پکڑیو" کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ قافلے میں یکایک گھبراہٹ سی پھیل گئی اور نوجوانوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لئے۔

کھیتوں کی طرف دو آدمی بھاگے جا رہے تھے اور اُن کے پیچھے خوبصورت گھوڑسوار گھوڑا دوڑاتا جا رہا تھا۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر گھوڑسوار نے ان آدمیوں کو جا لیا اور انہیں لٹا دیا۔

"کیا بات ہے؟"

چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ چھکڑے کھڑے ہو گئے اور بہت سے لوگ چھکڑوں سے اتر آئے۔ ایک شخص سفید رنگ کی گھوڑی پر سوار آیا اور اس نے پکار کر کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ سکھ بھینس لے گئے ہیں۔ بھینس کا مالک طیش کھا کر ان کے تعاقب میں بھاگا۔ لیکن اسے روک لیا گیا ہے۔"

بیلوں کی گھنٹیاں بجیں اور ٹکارنے اور ہانکنے کی آوازیں پھر ایک شور کے

ساتھ بلند ہوئیں فضل کریم نے کروٹ بدلی۔ اس کا بخار صبح کے وقت قدرے کم ہو جاتا تھا۔ اب اُسے ٹھنڈک بھی محسوس نہ ہو رہی تھی۔ سڑک پر غبار کے بادل اُٹھ رہے تھے اور تیسرے چھکڑے کے پیچھے صرف غبار ہی غبار نظر آتا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" فضل کریم نے اپنے قریب سے نور کی آواز سنی فضل کریم نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ چھکڑے کی بائیں طرف دھرے کے تختے پر پاؤں لٹکائے کھڑا تھا۔

"اوپر آجاؤ۔"

وہ اچھل کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے خاکی فوجی قمیص اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اور اپنے سر پر دھول سے بچاؤ کے لئے ایک نسواری رنگ کا رومال باندھ رکھا تھا۔ وہ ان کے گاؤں کے بوڑھے درزی کا بیٹا تھا۔ جنگ میں بھرتی ہو کر حوالدار کلرک ہو گیا۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد اس نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ دکھا کر اپنا ڈسچارج لے لیا۔

"نور" فضل کریم نے پوچھا "ہم اپنے وطن سے نکلے ہیں یا نکالے گئے ہیں؟"

نور اپنے دانتوں میں ایک تنکا لئے چبا رہا تھا۔ وہ بہت دور دیکھ رہا تھا۔ جہاں شیشم کے دو رویہ درختوں کی قطاریں ایک نقطہ پر مل گئی تھیں۔ اب اُن کا راستہ ایک رجبہا کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔

نور کے نتھنے پھول گئے۔ "ہم نکالے گئے ہیں۔ ایک منظم سازش کے ماتحت اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اپنا حق طلب کیا تھا۔"

فضل کریم بڑبڑایا۔ "حق ——— کس نے طلب کیا تھا؟"

نور نے چونک کر فضل کریم کی طرف دیکھا۔ فضل کریم راجباہ کی طرف رُخ کیے لیٹا ہُوا تھا۔ وہ اس مال و دولت کے متعلق سوچ رہا تھا جو جلدی میں چلتے ہوئے وہ لانا بھول گئے تھے۔ پھر وہ بولا: "نھتو کو تم جانتے ہو نھتو چیدار اوہ اپنے تمام زیورات اور نقدی چھوڑ آیا ہے۔"

"صندوق میں یا زمین میں۔"

میرا خیال ہے کہ زمین ہی کے حوالے کر آیا ہو گا۔" پھر فضل کریم نے کہا: "لیکن مستری نظام الدین تو اپنا سب روپیہ زیور لے آیا ہے۔"

"ہاں" نور نے جواب دیا: "کیونکہ وہ آٹھ آنے فی تولہ کے حساب سے قیمت وصول کرتا رہا ہے۔"

فضل کریم کا تخیّل پھر گھوڑی کے تھان پر پہنچ گیا۔ ایک سیاہ رنگ کی گھوڑی تھان پر کھڑی بھوسہ کھا رہی ہے۔ اس کا جسم سورج کی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ غور و قوت سے وہ اپنے اگلے پاؤں زور زور سے زمین پر مارتی اور ہنہناتی۔ اب اس کا مالک کون ہو گا؟ فضل کریم کی آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ فام سکھ کی تصویر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے چھلنی ہو رہا ہے۔ اس نے گھوڑی کو تھان سے کھولا اور اچھل کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ دروازے سے نکلتے ہی اس نے گھوڑی کو بن جبتی زمین میں ڈال دیا۔ جس میں پانی کی وجہ سے دلدل اور کیچڑ پیدا ہو گیا

تھا۔ خوبصورت گھوڑی کے چمکیلے جسم پر کیچڑ کے چھینٹے پڑ رہے تھے۔ اور اس کی ٹانگیں کیچڑ میں دھنس رہی تھیں۔ لیکن وحشی سکھ اسے بدستور ایڑیاں لگا رہا تھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ اور اس کے منہ سے کف گرنے لگی۔ وہ فضل کریم کی طرف ملتجی اور ترحم انگیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ فضل کریم یہ منظر کبھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اور وہ چلّایا

"او بدتہذیب وحشی، چھوڑ دو اسے۔"

نور نے اسے آہستہ سے جھنجھوڑا۔ قافلہ ایک شور قطعہ زمین کے سامنے رک گیا۔ لوگ اِدھر اُدھر ایندھن کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ عورتیں زمین میں چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود کر چولہے بنا رہی تھیں۔ فضل کریم کی بیوی چھکڑے کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔ وہ ضروریات کی چھوٹی چھوٹی اشیا اکٹھی کر رہی تھی۔ پھر اس نے کیتلی مانجھ کر چولھے نما گڑھے پر رکھ دی۔

"کیا پکا رہی ہو؟" فضل کریم نے پوچھا۔

"وہی دال جو گھر سے پیس کر لائی تھی۔" اس کی بیوی نے جواب دیا۔ وہ آگے آئی اور چھکڑے کے جوئے پر کھڑی ہو گئی۔ "تمہاری کیسی طبیعت ہے؟" وہ محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا گندمی رنگ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں سنہری دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کی پُرنم آنکھوں میں سنہری کرنیں تھرتھرا رہی تھیں۔

"میرا جی کسی سبزی کے لئے چاہ رہا ہے؟" فضل کریم نے آہستہ سے کہا۔

"اگر کہو تو کسی نزدیکی کھیت سے سبزی دیکھ بھال کر لے آؤں ؟"

"نہیں، اس سڑک سے ایک انچ بھی پرے مت جاؤ۔" پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بابو کہاں ہے ؟"

"وہ بیلوں کے لئے چارہ لینے گیا ہے۔"

زینب اپنے کاموں میں پھر مشغول ہو گئی۔ فضل کریم نے سوچا بابو کو یوں چارہ لانے نہیں جانا چاہئے تھا۔

وہ بھی انہی خیالات میں گم تھا کہ اُس نے ایک وحشت زا چیخ سُنی۔ رجبہا کی دوسری طرف سے ایک شخص نمودار ہوا۔ وہ سر سے پیر تک خون میں رنگین ہو رہا تھا۔ "یہ کیا ؟" فضل کریم چونک کر اُٹھ بیٹھا۔

لوگ دوڑ کر اس کی طرف گئے۔ وہ بابو تھا۔ قافلے میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ کئی لوگ گھوڑے دوڑاتے قافلے کے پرے سرے سے آ رہے تھے۔ لوگوں کا ایک مجمع سا لگ گیا۔ کچھ نوجوانوں نے میانوں سے اپنی تلواریں نکال لیں۔ ایک نوجوان کی آنکھوں سے مجنونانہ وحشت سی چھلکنے لگی۔ وہ کچھ دیر تو چپ رہا۔ پھر ایکا ایکی اچھلا اور یہ کہتے ہوئے بھاگ نکلا۔ "میں ماروں گا یا مر جاؤں گا" لیکن وہ خوبصورت گھوڑ سوار جس نے رجبہا کی پڑی ٹھیک کروائی تھی اس کے پیچھے بھاگا اور اُسے کمر سے جا کر پکڑ لیا۔

"ہمیں اس وقت دانائی اور تدبر سے کام لینا چاہیئے۔ ایک گلہری پہاڑ کو کب گرا سکتی ہے ؟"

بھیڑ آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔ دو آدمیوں نے بابو کو سہارا دے کر چھکڑے تک پہنچایا۔ وہ چھکڑے کے نزدیک آتے ہی گر گیا۔ فضل کریم جلدی سے اُٹھا اور چھکڑے سے اُتر آیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ مگر وہ بابو کے پاس بیٹھ گیا۔ اُسکی بیوی زور زور سے چلّانے لگی۔

فضل کریم کا گلا گھٹنے لگا وہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔

"بابو تم کیوں گئے تھے؟"

بابو نے شدتِ درد سے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ تلوار کا دوسرا وار سر پہ کیا تھا مگر وہ سر کو چھوتی ہوئی بائیں شانے میں لگی۔ اس کے گھاؤ سے قرمزی خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا۔

"زینب راکھ لاؤ۔"

لیکن بابو نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا زخم کی حدت سرد ہو رہی تھی اور جسم میں اینٹھن سی پیدا ہونے لگی لمبے وقفے کے بعد وہ بولا۔ اس کی آواز میں خشونت اور کھردراہٹ تھی۔

"میرے لئے کوئی چارا نہ کرو، مجھے سکون کے ساتھ مرنے دو۔"

بابو نے فضل کریم کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

"کریم، ہم نے اچھے دن گذارے۔"

فضل کریم کا ہاتھ بابو کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑ تی

جا رہی تھی۔ شدت درد سے اس کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ مگر وہ اس طرح ضبط کر رہا تھا کہ اپنی کراہ کی آواز بھی نکلنے نہ دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا سانس غرغرہ میں تبدیل ہو گیا۔ غروب سورج کے ساتھ ہی بابو کے آخری سانس بھی ختم ہو گئے فضل کریم کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ نکل چکا تھا۔ اس کا سر چھکڑے کے پہیے کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اور اس کا دھڑ خاک میں لتھڑ رہا تھا۔ اس کے قریب خون کا ایک چھوٹا سا جوہڑ بن گیا تھا۔

۳

قافلہ نہر کے ایک بنگلے پر آ کر رک گیا یہ نہایت سرسبز و شاداب جگہ تھی خوبصورت بنگلے کے گرداگرد چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے جن کے مکین کئی دن ہوئے بنگلہ چھوڑ کے جا چکے تھے۔ کوارٹروں کے گرد اوپلوں اور جھانکڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ بنگلے کی روشیں ناصاف اور گرد آلود تھیں۔ قافلہ بنگلے کے سامنے گھاس کے کھلے میدان میں اتر پڑا۔ گھاس کے یہ تختے بنگلے کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور بنگلہ ان کے عین مرکز میں واقع تھا۔ نہایت سرعت سے پڑاؤ جمنے لگا۔ بنگلے کی روشوں پر اور نہر کے کنارے راستہ پر چھکڑے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔

جب وہ بنگلے کے قریب پہنچے تو سب سے اگلے چھکڑوں پر سرگوشیاں ہونے لگیں یہ سرگوشیاں ایک ہلکے سے شور کی صورت میں رینگتی ہوئی پچھلے چھکڑوں تک پہنچ رہی تھیں۔ گھوڑ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے قافلے کے اگلے سرے پر پہنچ گئے۔ قافلہ کھڑا ہو گیا۔ اور چند ایک آزمودہ کار اور جہاندیدہ آدمیوں کی پنچایت

منعقد ہوگئی۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ جنگلے ہی پر پڑاؤ ڈال دیا جائے۔

"ہمیں بڑھنا چاہیئے ہمیں رُکنا نہیں چاہیئے۔" ایک تپلے دراز قد زمیندار نے کہا۔ اور جب وہ بول رہا تھا۔ اس کی گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔

"تحمل سے، صبر سے کام لو، حوصلہ کرو۔" ایک حنائی رنگ کی داڑھی والے بوڑھے نے کہا۔ اس کی تیز آنکھیں کسی چیل کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ اس کی گھنی بھنویں آنکھوں کے پپوٹوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی پیشانی کی لکیریں اس کے مفکرانہ ذہن کی غمازی کر رہی تھیں۔ یقیناً وہی پنچایت کی سربراہی کر رہا تھا۔

"تم اس علاقہ اور اس گرد و نواح سے خوب واقف ہو؟" بوڑھے سرخیل نے معترض سے پوچھا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔ دشمن کا جال اس کے چپے چپے پر بچھا ہوا ہے۔"

"تو پھر تم جال کے اندر گھسنا چاہتے ہو۔ یا اس کے تاروں سے باہر رہنا چاہتے ہو؟" اس نے اسی تحکمانہ خود اعتمادی کے ساتھ دریافت کیا۔ اس کی نظر صورت حال کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ ماحول اس کے سامنے ایک کھلے بساط کی مانند پھیلا ہوا تھا۔

"ہم نہ تو جال کے اندر پھنسنا چاہتے ہیں اور نہ اس سے باہر کھڑے رہنا، ہمیں اس مقام سے نکل جانا چاہیئے۔"

دوسرے لوگ معترض کے ہم نوا معلوم ہوتے تھے۔ پنچایت کے گرداب کی ٹھٹھ

سا لگ گیا۔ سات مدبّر گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے اور اُنکے درمیان مٹّی کا حقّہ دھرا ہُوا تھا۔

"تو میں یقین دلاتا ہوں ہم اِس مقام سے جتنا دُور جائیں گے ہم جال کے اندر ہی جائیں گے۔ ہم یہاں سے اس وقت ہلیں گے جب ہماری مدد کو ملٹری پہنچ جائے گی"

سب لوگ چپ ہو گئے۔

"تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ جس وقت ہم نے یہ جگہ چھوڑ دی تو ہم کتنے خطرہ میں گھِر جائیں گے۔ ہم پر دشمن اِس طرح جھپٹے گا جس طرح ایک گدھ مردار پر جھپٹتا ہے ہم موت کے کھلے میدان میں کھڑے ہوں گے۔ دشمن کی ہر گولی ہم میں سے ایک نہ ایک کے سینے کو چھلنی کرتی جائے گی۔ دشمن کا ایک ایک وار ہماری کسی نہ کسی رگ کو کاٹتا جائے گا"

جب لوگ منتشر ہو گئے تو نور فضل کریم کے پاس آیا اور اُس نے اسے بتایا کہ اصل وجہ رکاوٹ کی یہ تھی کہ سکھوں کا ایک مسلح جتھا دھر سے گزرتے دیکھا گیا تھا۔ وہ جوار اور ایکھ میں چھپتے ہوئے جا رہے تھے اور یہ خدا کا فضل ہے کہ وہ حملہ نہ کر سکے۔

"تم اُٹھ کر چلتے پھرتے کیوں نہیں، ایک جگہ بیٹھے رہنے سے تو تمہاری طبیعت اور بھی خراب ہو جائے گی"۔ زینت نے فضل کریم سے کہا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی۔ اب وہ سرکنڈوں کے بنے ہوئے ایک جھاڑو سے شیشم کے گرے ہوئے پتّے اکٹھے کر رہی تھی۔

فضل کریم کا دل بھر ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کے سامنے گاؤں کی مکمل تصویر کھڑی ہو گئی۔ کچے کوٹھوں کی چھتوں کے اوپر مسجد کے بلند مینار اور حکی کی خواب آلود گھمر گھمر۔

"نور، نور، تم پڑھے لکھے ہو، تم نے فوج کی ملازمت میں ملک ملک کی سیر کی ہے۔ تم مجھے بتا سکتے ہو کہ زندگی کس لئے ہے اور ہم کیوں پیدا کئے گئے ہیں۔ ذرا سوچو تو سہی ہم بچپن سے لے کر جوانی تک کسی کے سہارے پلتے ہیں جب اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں تو دوسروں کے بوجھ ہم پر آن گرتے ہیں۔ جب ہم ان بوجھوں سے اپنا کندھا کھسکا لینے کا ڈھنگ سیکھ کر ان سے فراغت حاصل کرتے ہیں تو ہماری عمر ہی ختم ہو جاتی ہے بتاؤ تو ہم کس لئے پالے گئے ہیں؟ اس لئے کہ ایک دن ہم اپنے گھروں سے ڈنگروں کی طرح نکال دیئے جائیں اور مصائب کی چکی میں اپنے ہاتھوں اپنی جان پسوا لیں۔"

"میں تمہیں بتاتا ہوں"۔ نور نے تھوکتے ہوئے کہا: "فوج میں مجھے ایک بلوچی نے بتایا کہ زندگی ایک دیو ہے جس کی جان ایک طوطے میں ہے اور وہ طوطا خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

فضل کریم یک لخت اٹھا اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ نور چپ چاپ دور دیکھ رہا تھا وہ ہنسا نہیں لیکن اس کی آنکھوں کے کناروں پر غیر مرئی مسکراہٹ سے لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ لیکن میں یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ میں مرنے کے لئے بالکل تیار ہوں، کم از کم اس خانہ بدوشی اور خطرے سے لبالب بھری زندگی سے تو نجات مل جائے گی۔"

فضل کریم اس تصور سے کانپ اٹھا: "میں موت چاہتا ہوں لیکن یہ ہیجان، موت سے میرا جی گھبراتا ہے۔ میں بیمار ہوں، میں چاہتا ہوں، میں اسی طرح آہستہ آہستہ موت کی

آغوش میں پہنچ جاؤں۔ ایک زندگی سے نکل کر دوسری زندگی میں جانا ایسا ہے جیسے کچی سڑک پر کھڑکھڑاتے یکے سے نکل کر دلدل میں تھکے پاؤں گھس جانا۔"

"آؤ، ذرا نہر پر منہ ہاتھ دھولیں۔"

نور نے فضل کریم کا ہاتھ پکڑ کر اسے چھکڑے سے اتارا۔ اور وہ دونوں نہر کی طرف چل دیئے۔

گھاس کے تختوں پر عورتیں چولھے کھودنے میں مصروف تھیں۔ چند ایک نوجوانوں نے بنگلے کے کواڑ دھکے دے کر کھول لئے تھے اور اندر گھس کر شور مچا رہے تھے۔ بنگلے کے کمروں میں ان کے شور کی گونج اور کرسیاں توڑنے کی آواز آ رہی تھی۔ چار لڑکے روشن دانوں پر پاؤں ٹکا کر بنگلے کی چھت پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نہر کے کنارے پر لوگوں کی کافی بھیڑ تھی۔ عورتیں برتن مانجھ رہی تھیں۔ اور مرد نہا رہے تھے۔ نہر کے پانی میں لوگوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ نہر کے کناروں پر شیشم کے درختوں کی دو رویہ قطاریں تھیں جن کے بیچ میں سرکنڈوں کی بڑی بڑی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ درختوں پر پرندوں کی چہکار سنائی دے رہی تھی۔ ایک سرخ رنگ کا پرندہ فضل کریم کے عین قریب میں آ کر بیٹھ گیا اس کی چونچ سیاہ اور لمبی تھی۔ اور اس کے سر پر سنہری مائل کلغی پھول کے نازک ریشوں کی طرح تھرتھرا رہی تھی۔

بہت سے لوگ درانتیاں لے کر ارد گرد جوار اور رکماد کے کھیتوں میں گھس گئے جب سورج ذرا اور نیچے ہوا تو ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی اور جنوبی سمت سے دھان کی خوشگوار خوشبو کے جھونکے آنے لگے۔

اسی اثنا میں نہر کی پٹری پر دُور سے ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ پہلے تو تیزی سے آ رہی تھی پھر آہستہ ہو گئی۔

بنگلے سے ایک لمبی چیخ اُٹھی۔ یہ اکٹھے ہو جانے کی پکار تھی۔ نہر سے لوگ اُٹھ اُٹھ کر بنگلے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ کھیتوں میں چارہ کاٹنے والے کھانے پھلانگتے ہوئے بنگلے کی طرف بھاگ رہے تھے یکایک سارے قافلے میں کھلبلی سی مچ گئی۔

بنگلے کی چھت پر جوان سپاہیوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ ایک نے پیپا اٹھایا اور اسے شیشم کی چھڑی سے زور زور سے کوٹنا شروع کر دیا۔ تمام عورتیں بنگلے کے اندر بند کر دی گئیں۔ جو سامان تھا انہیں بنگلے کے برآمدے میں جمع کر دیا گیا۔ اور بنگلے کے گرد جوان آدمیوں کی ایک باڑھ بنا دی گئی۔

فضل کریم نور کا ہاتھ پکڑے سرکنڈوں کی جھاڑیوں میں اُلجھتا ہوا بنگلے تک پہنچا فضل کریم کا سانس اُکھڑ گیا تھا اور وہ اس طرح ہانپ رہا تھا گویا کہ وہ ضیق النفس میں مبتلا ہو۔ چھکڑے کے پاس پہنچتے ہی وہ بے بس ہو کر گر گیا۔ اس کی ٹانگیں پھول گئیں۔ اور اس کی نگاہوں کے سامنے بنگلہ جھول رہا تھا۔ اس کی جسمانی حالت جواب دے رہی تھی۔ بایں ہمہ وہ چھکڑے پر چڑھ کر اس سمت ہی دیکھنے لگا۔ جہاں کار کھڑی تھی۔ لیکن سرکنڈوں کے لہراتے ہوئے ریشمی گچھوں کے سوا اُسے کچھ دکھائی نہ دیا۔

"کار کہاں ہے؟" نیچے سے کسی نے پکار کر چھت والوں سے پوچھا۔

"وہ کھڑی ہے"۔ ایک نوجوان نے کہا۔ جس کے گلے کے ساتھ کارتوسوں کی

پیٹی لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی۔ جب اس نے کار کی سمت میں ایڑیاں اٹھا کر دیکھا تو اس کا چہرہ سورج کی روشنی میں سرخ ہو گیا۔

بنگلے کے گرداگرد برچھے اور ننگی تلواریں چمک رہی تھیں۔ برچھوں کی آہنی نوکیں سورج کی بالائی کرنوں میں آگ کے شعلوں کی طرح چمک اٹھتیں۔ اور ان کے پکڑنے والے داخلی اضطراب کے ساتھ ان کے اوپر جھکے ہوئے سامنے دیکھ رہے تھے۔

"میری زندگی کی آخری گھڑی آچکی ہے۔ اب یہ بھی گذر رہی ہے آئندہ گھڑی میں کیا ہونے والا ہے؟" فضل کریم نے اپنے آپ کو چادر میں اچھی طرح لپیٹ لیا۔ لیکن اس کی تھرتھری بند نہ ہوتی تھی۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کانپ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا: "وہ بھی میں ہی ہوں گا جس کے ساتھ آئندہ گھڑی میں کچھ بیتنے والا ہے۔ جب قتل و غارت میں میرے قتل کی باری آئے گی تو مجھ پر تلوار کس طرح برسے گی؟" اس خیال کے ساتھ ہی اس کا سانس گھٹنے لگا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ قبر کی گہرائیوں میں اتر رہا ہے اور لوگ اس پر مٹھیاں بھر بھر کر مٹی پھینک رہے ہیں اس نے گھبرا کر چادر کا پلّو اپنے چہرے سے ہٹایا اور ایک لمبا سانس کھینچا۔ اپنے تئیں مجسّم دیکھ کر اس کا دل قدرے مطمئن ہوا۔

وہی بوڑھا رہبر لوگوں کے جمگھٹے میں کھڑا تھا۔

"اس طرح دہشت پیدا کرنا ٹھیک نہیں۔ اگر وہ حملہ آور نہیں تو انہیں گذرنے دیا جائے۔ تم انہیں ڈرا کر بھگاؤ گے تو حملہ یقینی ہے۔"

"لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ وہ حملہ آور نہیں ؟" پنچایت کے ایک رکن نے کہا جو ایک موٹا سا آدمی تھا، اور جس کے سر کی چندیا بالوں سے خالی تھی ۔

"ہم دو آدمی بھیجد یں جو سرکنڈوں کے پچھواڑے جوار کے کھیتوں میں چھپتے جائیں اور معلوم کرآئیں کہ وہ بے ضرر رہیں ۔" بوڑھے کی آنکھوں میں گہرائی اور چمک پیدا ہوگئی اس کی تہ میں کھپنے والی آنکھیں دور سرکنڈوں کی طرف دیکھ رہی تھیں ۔

معاً دو برچھیوں والے نکلے اور کھیتوں میں گھس گئے ۔ ان کے چہرے ڈھاٹوں میں چھپے ہوئے تھے ۔ اور ان کی کمروں کے ساتھ پستول لٹکے ہوئے تھے ۔ تمام مجمع پر خاموشی چھا گئی صرف بنگلے کے اندر عورتوں کی دبی آوازیں اور بچوں کی ریں ریں سنائی دے رہی تھی یا پھر درختوں کے اوپر ماحول سے بے خبر ایک پرندہ چہچہا رہا تھا ۔

ایک طویل خاموشی کے بعد چھت پر سے ایک شخص نے پکار کر کہا "کوئی خطرہ نہیں" اس کے سنتے ہی سب لوگ اپنی اپنی جگہ سے ہلنے لگے ۔ پنچایت کے ایک شخص نے بلند آواز سے کہا : کوئی شخص بنگلے کی حدود سے باہر مت نکلے ۔" ساری پنچایت چل کر بنگلے کے پھاٹک پر آن کھڑی ہوئی اور ان میں سے دو رکن خالی ہاتھ باہر نکلے اور کار کی طرف چل دیئے ۔

بنگلے میں پھر شور پیدا ہوگیا ۔ عورتیں یلغار کرتی ہوئی کمروں سے نکل آئیں اور بچے چیخنے چلانے لگے ۔ ایک جوشیلا لپک کر برآمدے کی طرف آیا اور گھاس کے تختے پر نکلتی ہوئی عورتوں پر جھپٹا "باہر مت نکلو ۔ باہر مت نکلو ۔"

پھاٹک پر کھڑے ہوئے تمام لوگوں کی نگاہیں نہر کی پٹڑی پر جمی ہوئی تھیں ۔ وہ

چپ تھے۔ پھر کار کے چلنے کی آواز آئی۔ اور جوں جوں وہ قریب آرہی تھی ان کے دلوں کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ کار تیزی سے فراٹے بھرتی ہوئی ان کے سامنے سے نکل گئی۔ اس کی کھڑکیوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔ اس لئے بیٹھنے والوں کی صورتیں دکھائی نہ دے سکیں۔ جب کار گذر گئی تو پھاٹک والے بڑھ کر پٹڑی پہ آ گئے۔ دونوں رکن کار کے پیچھے بازو لٹکائے چلے آرہے تھے۔

"وہ نہر کا ایس۔ ڈی۔ او تھا، بڑے تپاک سے ملا۔"

بنگلے میں پھر شور بھرنے لگا۔ دھوئیں کے حلقے اٹھتے ہوئے اوپر جا رہے تھے۔ اور برتنوں کی کھنکھناہٹ سے فضا پھر معمور ہو گئی۔

نہر کے پرلی طرف سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس کی سُرخ کرنیں آسمان کے دامن پہ منتشر ہو رہی تھیں۔ نہر کا پانی کرنوں کی آتشیں جھلملاہٹ سے تھرتھرانے لگا۔

۴

رات تاریک اور بے نور تھی۔ اتنی دُور آسمان پر ستاروں کی مدھم روشنی سے آخر کتنا اجالا ہو سکتا تھا؟ آسمان کی سیاہی زمین کی سیاہی میں تحلیل ہو چکی تھی۔ افق کا امتیازی خط مٹ چکا تھا۔ لیکن جب رات کا کچھ حصّہ گذر چکا تو ایک نمناک سا اجالا چاروں طرف پھیل گیا اور زمین کے اوپر افق کے کنارے کنارے ایک ملگجے رنگ کی سفیدی شور زمین کے نمک کی طرح ابھر آئی۔

نہر کے کنارے پہ سے بنسری کی آواز تیرتی ہوئی آئی اور فضا میں پھیل گئی۔ اس کا

نغمہ شبنم آلود سکون کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اُترنے لگا۔ لیکن یہ جلد ہی بند ہو گئی۔ شاید بند کرا دی گئی۔

اس کے بعد پھر سکوت طاری ہو گیا۔ بنگلے میں بچوں کی سسکیاں اور عورتوں کی گفتگو بدستور سابق جاری تھی لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ یہ آوازیں بھی گھٹ گئیں کسی جگہ سے جماہی کی لمبی آواز سنائی دیتی اور ساتھ ہی کوئی اللہ کو پکار اُٹھتا۔ بنگلے کے اردگرد اور نہر کے کنارے پر دور دور تک پہرہ داروں کے چلنے پھرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

فضل کریم آہستہ سے اُٹھا اور بنگلے سے باہر نکل آیا۔ اس کی بیوی چادر لپیٹ کر چھکڑے کے پہیّے کے ساتھ سر لگا کر سو گئی تھی۔ جب فضل کریم اس کے پاس سے گذرا تو اس کا دل اسے اس حالت میں دیکھ کر بھر آیا۔ سارا دن کام کاج کرتے کرتے اس قدر تھک جانے کے باوجود وہ ایک دن بھی اپنی زبان پر حرفِ شکایت نہ لائی۔ پھاٹک سے باہر نکلتے ہی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے اس کے چہرے کو چھوئے۔ اسکے جسم میں کپکپی پیدا ہوئی۔

نہر کے کنارے پہرے داروں کا خوب جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ پل پر چار نوجوان بیٹھے ہوئے اندھیرے میں تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے برچھے ان کے پاس زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ جب وہ ان کے قریب سے گذرنے لگا تو اس نے نور کی آواز سنی۔

"ادھر میرے قریب بیٹھ جاؤ۔" نور نے اس کے لئے جگہ بنا دی۔

وہ تاش کے پتّوں کو آنکھوں کے قریب لے جاکر شناخت کرتے اور پھر پھینکتے وہ پہلے کٹ پیس کھیلتے رہے۔ پھر برج کھیلنے لگے۔ اس کھیل میں معاملہ ذرا زیادہ پیچیدہ

ہو گیا۔ اور کھلاڑی سوچ سوچ کر چالیں چلنے لگے۔ ان کی خاموشی اس وقت ٹوٹی جب ایک گھنے بالوں والے لڑکے نے کہا "یار سنا ہے اس جگہ سانپ بڑے ہوتے ہیں۔"

ایک کھلاڑی جس کی شکل و شباہت اور حرکات سے ٹپکتا تھا کہ وہ ورزش و پہلوانی کا رسیا ہے بولا "ہاں، تمہیں ان کا زہر چاہیئے" تیسرا کھلاڑی فلمی قسم کا تھا۔ اس نے پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اور اس کے سر کے بال اتنے گھنے اور لمبے تھے کہ پیچھے سے دیکھنے سے اس کا سر تربوز کی مانند بڑا دکھائی دیتا تھا۔ وہ سیماب کی طرح تھرک رہا تھا۔ ہر بات میں وہ مصنوعی سے طیش میں آجاتا۔ اور جب کوئی بات سناتا تو معلوم ایسا ہوتا کہ وہ مبالغہ آمیزی سے ملمع کر کے پیش کی جا رہی ہے۔ وہ چھرا گھونپنے والے گروہ میں بھی رہ چکا تھا۔ اور جب وہ چھرا گھونپنے کی ایک واردات بیان کرنے لگا تو وہ ایک مخفی جوش سے اُبل رہا تھا۔ اور اس کی نشیلی آنکھیں سُرخ ڈوروں سے بھر گئیں جب وہ اپنی آنکھوں کے گوشوں سے کسی کی طرف دیکھتے ہوئے بات کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا وہ کسی فلم کا وِلین ہے۔

یہ عید سے ایک روز پہلے کی بات ہے ہم بازار میں کھڑے تھے کہ یکایک سعید نے آ کر سنایا کہ سکھوں نے حملہ کر دیا۔"

"تم اس وقت شہر میں تھے؟" نور نے پوچھا۔

"میں اس وقت شہر میں تھا میں اور سعید اور دو اور لڑکے جو اس وقت پان اور سگریٹ کی دوکان پر کھڑے تھے چل دیئے، بالکل نہتے، جب ہم کوتوالی کے قریب پہنچے تو اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ یہ بالکل افواہ تھی ہم پلٹ پڑے، لیکن جونہی ہم کوتوالی کے آدھ

سے نکلے تو سامنے سے ایک ہٹا کٹا سکھ چلا آ رہا تھا۔ وہ ہمارے پاس سے گذرا تو اس نے ہماری طرف اِس انداز سے دیکھا گویا اس کا بس چلے تو ہمیں کھا جائے (یہاں اُس نے ایک موٹی گالی دی) میں نے سعید سے کہا جانے نہ پائے چشم زدن میں وہ لعین ڈھیر ہو کر زمین پر آ رہا۔ اور دوسرے گھنٹے میں شہر کرفیو سے بند تھا۔

"تم نے چھرا کیسے گھونپا؟" ورزشی کھلاڑی نے پوچھا۔

"چھرا دو جگہ گھونپا جاتا ہے۔ گردن میں یا پیٹ میں، گردن میں گھونپا جائے۔ تو ہاتھ کو بلند کر کے یوں مارا جاتا ہے۔ اور جب پیٹ میں گھونپا جائے تو یوں ——"

اس نے اپنے بازو کو اس کے پیٹ کی طرف سیدھا کرتے ہوئے دکھایا۔

فضل کریم کی طبیعت ڈگمگانے لگی اس نے محسوس کیا کہ نہر کی خنکی اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور چل دیا۔ نہر رات کی سیاہی میں میلی کچیلی چادر کی طرح زمین پر بچھی دکھائی دے رہی تھی۔ پھاٹک کے قریب ڈھینگر گھاس میں زور زور سے بول رہے تھے۔

پھاٹک سے لے کر بنگلے تک روش کے کنارے کنارے ڈھور ڈنگر بندھے ہوئے تھے بھینس اور بیل زور زور سے پھنکار رہے تھے۔ ان کے گرم سانس سے فضل کریم کی کپکپاہٹ قدرے کم ہو گئی۔ اس کے چھکڑے کے قریب ایک سفید رنگ کا گدھا بندھا ہوا تھا۔ فضل کریم نے اس کے پاس سے گذرتے ہوئے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا مگر اس نے اس کے ہاتھ کو کاٹنے کے لئے منہ بڑھایا۔ "شیطان کا بچہ" فضل کریم بڑبڑایا۔ اور اپنے

چھکڑے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم نے بتایا کہ بخار پھر تیز ہو گیا ہے۔

اس کی بیوی گہری نیند سو رہی تھی۔ فضل کریم اس پر جھکا تاکہ اس کے خد و خال کو اچھی طرح سے دیکھ سکے اس کی بڑی بڑی پلکیں کھجور کے نکیلے پتوں کی طرح ملی ہوئی تھیں۔ اور اس کا سانس یکساں چل رہا تھا۔ اس کا دل یکایک اس کی محبت سے بھر گیا۔ وہ کچھ دیر اور کھڑا دیکھتا رہتا۔ مگر اس کا سر چکرانے لگا۔

وہ چھکڑے کے اوپر چڑھ گیا۔ اور ٹرنک پر بچھے ہوئے توشک پر لیٹ گیا۔ شیشم کے درختوں کی بلند ٹہنیاں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ جس سے ایک گھنا منڈپ بن گیا تھا۔ پتوں کے درمیان آسمان کے ستارے چمکتے ہوئے موتیوں کی طرح ٹکے دکھائی دے رہے تھے فضل کریم نے اپنے دائیں نگاہ ڈالی۔ ایک بہت بڑا ستارہ چمک رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صرف اسی کی تابانی سے سیاہی میں اتنا اجالا تھا۔

وہ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ چھکڑے سے نیچے لٹک گیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنا چاہا لیکن وہ پھر لٹک گیا۔ بڑا ستارہ بدستور چمک رہا تھا۔ اور نہر کی سرسراہٹ ٹھنڈی آہوں میں بدل گئی۔ فضل کریم نے کانوں پر زور ڈال کر سنا پھر دل میں کہا: یہ کیا وجہ کہ نہر آہیں بھر رہی ہے۔ شاید وہ کسی آنے والے حادثہ کو بھانپ گئی ہو بچپن سے یہ بات سنتے آئے ہیں کہ قبر میں جب مردے کو عذاب ہوتا ہے تو انسان کے سوا ہر چرند پرند اس کی سینہ شگاف چیخوں کو سنتا ہے تو یہ ٹھیک ہے کہ انسان کے

سوا دنیا کی ہر مخلوق ایسے واقعات کو پہلے ہی سے بھانپ لیتی ہے۔

فضل کریم نے محسوس کیا کہ اس کی کمر بہت جھک گئی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ اس کے پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اتنے ٹھنڈے گویا کسی نے ان کو شورا کے پیالوں کی برف میں رکھ دیا ہو۔ لیکن فضل کریم کو پیروں کی خنکی کوئی تکلیف نہ دے رہی تھی۔ وہ نہایت آرام سے ٹکا ہوا تھا۔ اس کا دل پہلے سے زیادہ ڈوب گیا تھا۔ فضل کریم نے خیال کیا کہ اس کا دل کپڑے کی بنی ہوئی اس گیند کی طرح ہے جو پانی میں تیر رہی ہے۔ وہ اب تیر رہی ہے لیکن جونہی وہ پانی سے بوجھل ہو جائے گی تو وہ غڑاپ سے پانی کی تہ میں ڈوب جائے گی۔

ایکا ایکی اس نے محسوس کیا۔ نہر پر ہلچل سی مچ گئی۔ اور لوگوں کے تیز بھاگنے کی آواز بلند تر ہو گئی ہے۔ پھر دور کھیتوں میں آگ کے شعلے اُٹھنے لگے۔ غالباً بھوسوں کے ڈھیروں کو آگ لگی تھی۔ مگر وہ آگ پھیلتی ہوئی نزدیک آ رہی تھی۔ یہ سرکنڈوں کو بھی لپٹ گئی۔ آگ میں جلتے ہوئے سرکنڈوں سے دھوئیں کے بادل چکر کھاتے ہوئے اُٹھ رہے تھے۔ سرکنڈے اس طرح چیخ رہے تھے گویا آگ انہیں اپنے پاؤں تلے لتاڑ رہی تھی۔ جلتے ہوئے سرکنڈے سسکی کی سی آواز پیدا کرتے ہوئے تیروں کی طرح آسمان کی طرف اڑ جاتے۔

پھر گولیوں کے ٹھائیں ٹھائیں چلنے کی آواز آنے لگی۔ جگہ سُرخ روشنی میں روشن ہو گیا۔ بیلوں کی گھنٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں اور مویشی رسّے تڑا کر بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ بنگلے میں ایک کہرام سا مچ رہا تھا اور سیاہ سائے آگ کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔

"یہ کیا تماشا ہے، زینب، زینب" لیکن جواب میں ایک چیخ خنجر کی طرح اس کے دل میں کھب گئی۔ اس نے ٹکٹکی لگا کر دیکھا۔ بنگلے کی روش پر چار لاشیں خون میں لتھڑی پڑی تھیں۔ اس نے انہیں پہچاننے کی کوشش کی لیکن پہچان نہ سکا۔ جنگ بڑے گھمسان کی ہو رہی تھی نوجوان للکار للکار کر پکار رہے تھے: "شاباش، شاباش" پھر انہوں نے نعرۂ تکبیر لگایا اور بڑے زور سے لڑنے لگے۔ تلواروں کی جھنکار ایک بار پھر گونج اٹھی۔

پھر اس نے دیکھا زینب کو چار وحشی سکھ کھینچ رہے ہیں "ٹھہرو، حرامیو" فضل کریم چلایا مگر وہ جھکڑے سے اور زیادہ نیچے لٹک گیا۔ اس کے کانوں میں چیخ و پکار کی آوازیں اس طرح مدھم ہو رہی تھیں جیسے وہ اس مقام سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹی کی جھنکار لڑکھڑاتی ہوئی اس کے کان میں گری اور چھن سے بند ہو گئی۔ آگ کے شعلے ناچتے ناچتے سفید ہو گئے۔ پھر وہ سفیدی ایک بڑے ستارے کی چمک میں سمٹ کر آ گئی۔ اور فضل کریم کا دل غڑاپ سے پانی میں ڈوب گیا۔ ایک آخری آواز جو اس کے کانوں نے سنی وہ یہ تھی۔

اس کے بالیں کھڑا کوئی کہہ رہا تھا: "مارو اس کو۔"

کسی دوسرے نے جواب دیا: "چھوڑو، بیمار ہے۔"

لیکن پہلے نے کہا: "یہ بھی تو اسی قوم کا ایک فرد ہے۔"

پروانے

گاؤں کے شمال میں کپاس کے کھیت سے ایک لڑکی نکلی۔ وہ دھانی دوپٹہ، پیلی قمیص اور سرخ شلوار پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ہاتھ میں درانتی تھی اور اُس کی نگاہ دور اس مقام پر جمی ہوئی تھی۔ جہاں ایک بھینس چری کے ٹانڈوں میں اپنے سینگ اُلجھا رہی تھی۔ اس کا رنگ سفید نہ تھا۔ وہ دور سے سیاہی مائل دکھائی دے رہی تھی لیکن جب وہ قریب آئی تو اس کا چہرہ گندم کے دانے کی طرح سنہری اور لرزاں نظر آنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی اور دائیں گال پر ایک سرخ سا دھبّا جم کر رہ گیا تھا۔

سڑک پر دو بوڑھی عورتیں گزر رہی تھیں۔ ان کے لہنگے ہوا سے پھیل رہے تھے جب وہ لڑکی کے نزدیک سے گزریں تو اُنہوں نے اس کی طرف دیکھنے کی بجائے ایک سوکھے ببول پر نظریں گاڑ دیں جو سڑک کی پرلی طرف کھڑا تھا۔

ایک عورت بولی۔ "دیکھا اس کو؟"

دوسری نے جواب دیا۔ "ہاں کسی کو ڈوسے گی۔"

دوسری نے دیر بعد پوچھا۔ "کون ہے یہ؟"

"پہچانا نہیں؟ بہادر کی بہو جمّا کی بیوی ہے۔"

دونوں نے مڑ کر دیکھا وہ بھینس کو ہانک رہی تھی۔ وہ اس طرح اپنے کام میں محو تھی گویا ساری دنیا سے بے نیاز ہے۔ اُسے دنیا میں کسی کی پروا نہیں ہے!

"کیا وہ جوان سے پوچھ گچھ کرنے والا کوئی نہیں۔ اب تو دن وہاڑے لڑکے بھی منہ ناتے پھرتے ہیں اور لڑکیاں بھی، تمہیں کیوں یہ طور رکیا تا رہے ہیں؟ عورت کی مستی کبھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ دیکھو یوں چلتی ہے جیسے اُسے کسی کی پروا نہیں اور پروا ہو بھی کیوں۔ گھروالا بالکل اُلّو ہے اور اُسے ایک چھیل چھبیلا مل گیا ہے۔"

"وہ کون؟"

"عنایت، شیخ کا لڑکا۔"

مستری چراغ کی دکان پر جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ مستری چراغ ایک چھکڑا تیار کر رہا تھا۔ چھکڑے کا ڈھانچہ قریب قریب بن چکا تھا۔ اب بجنیاں بن رہی تھیں۔ مستری چراغ تیشہ لئے لکڑی چھیل رہا تھا اور اس کا بھتیجا حمید آری سے ایک تختہ چیر رہا تھا۔ فرش پر برادے کی تہہ جم گئی تھی۔ اسمٰعیل چھکڑا بنوانے والا ایک شہتیر پر بیٹھا لوہے کے ایک تار کے بل ہتھوڑی سے نکال رہا تھا۔ قریب ہی بیری کے نیچے چند آدمی بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔

اسمٰعیل نے ہنستے ہوئے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

رحمت نے جواب دیا "ہونا کیا تھا، جڑا چھڑے سے اڑ گیا۔"

اسماعیل پھر بولنے لگا: "مگر بھائی اس نے کیا کمال کر دی۔ نکال چھت پھاڑ نکل بھاگا اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔"

رحمت نے حقّے کا کش لیا اور مستری کی طرف رُخ کر کے بات سنانے لگا: "جب لڑکی سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ تو اُس نے بڑے بھولے پن سے پوچھا۔ کون؟ بہادر طیش میں آگیا اور اُس نے ہونٹ دانتوں میں چباتے ہوئے ایک گھونسا جمایا اور کہا "تیرا یار چھت کیسے پھٹی؟" اس نے جواب دیا۔ "مجھے کیا معلوم؟"

اتنے میں دروازے میں ایک سیاہ داڑھی والا پست قد کا آدمی آن کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل تھا لیکن نقش تیکھے تھے۔

"وہ آگیا۔" سب یک زبان بول اُٹھے۔

"کیوں بے عظیم! تو نے سی آئی ڈی کا کام کب سے شروع کیا؟"

وہ مسکراتا ہوا آیا اور حقّے کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک بوڑھا کش لگا رہا تھا جب اس نے حقہ چھوڑا تو عظیم پینے لگا۔

"رات جب بہادر، جگا اور منگو تینوں کولہو چلانے گئے: تو یہ لڑکا غایت باغ کے پچھواڑے چکر لگا رہا تھا۔ میں اس وقت کریم کی دکان سے اُٹھ کر گھر آ رہا تھا۔ میں نے پہلے تو کوئی گمان نہ کیا لیکن جس وقت کوئی ایک گھنٹے کے بعد میں گھر سے پیشاب کرنے کے لئے نکلا تو دیکھا کہ وہ ابھی باغ کے پاس ٹہل رہا تھا۔ میں واپس آ کر لیٹ گیا۔ میری چارپائی چھپر کے نیچے بیلوں کے پاس بچھی تھی۔ میں نے منہ پر لحاف اوڑھ لیا۔ مگر تھوڑا سا سوراخ رکھ کے اس میں سے

دیکھتا رہا جب اس نے جان لیا کہ میں سو گیا ہوں تو آہستہ آہستہ پنجوں کے بل چلتا آیا اور بہادر کے گھر میں داخل ہو گیا۔"

عظیم خاموشی سے پھر حقّہ پینے لگا لیکن اس کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ سب اس کی طرف استعجاب سے دیکھ رہے تھے۔

" دفعہ کرو اس کو" مستری چراغ نے تیشہ زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ "سوچنے کی بات یہ ہے کہ برائی کو روکا کیونکر جائے۔ اگر یہ اسی طرح بڑھتی رہی تو آج نہیں تو کل خود ہماری بہو بیٹیوں کی بھی خیر نہیں۔"

"سچ ہے" بڈھے رمضان نے کہا۔ "ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے۔"

" ارے میاں ہو گا کیا" عظیم ماتھے پر تیوری چڑھائے بولا۔ "شفیع اثر رسوخ والا آدمی ہے مالکوں سے اسکی بات چیت سے ہی بس معاملہ پیشاب کی جھاگ کی مانند بیٹھ جائے گا۔"

رحمت نے نار کو ناک کی پھننگ کے نزدیک لاتے ہوئے کہا۔ "ارے وہ تو ہوا۔ مگر جمّا بھی تو نرا اُلّو ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ اپنے گھر کی نگہداشت خود رکھتا۔"

"میاں نگہداشت کیا کرتا" رمضان نے جواب دیا۔ "آج شرافت کی کیا قدر ہے۔"

ابھی دوپہر کو رحمت نے دیکھا کہ جمّا اپنے مربع میں شیشم کے نیچے بیٹھا تھا اور اس کے نزدیک اس کی بکری اپنے پچھلے دونوں کھروں پر کھڑی ہتوں پر منہ مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جمّا کیسے ہو؟" رحمت نے گزرتے ہوئے پوچھا۔

" اچھے ہیں بھائی شکر ہے مولا کا" جمّا کی آواز بھاری اور رندی ہوئی تھی جب رحمت

قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ جمّا رو رہا تھا۔

اسی شام کو یہ بھی سننے میں آیا کہ منگو (جمّا سے چھوٹا) گھر میں اپنا برچھا ڈھونڈھ رہا تھا کہ بھاورا اس سے لپٹ گیا۔ "کیا کرتا ہے لڑکے" بڈھے باپ نے اس کو مضبوطی سے جکڑتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو چھوڑ دو۔ بے عزتی کے جینے سے مرنا بہتر ہے۔"

منگو اس وحشت سے چیخ رہا تھا کہ کف جاری ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جنون جھلک رہا تھا۔ اردگرد احاطہ کے تمام آدمی آ گئے اور سب نے مل کر اسے زبردستی چارپائی پر بٹھا دیا۔ بھاورا خود زمین پر بیٹھ کر رونے لگا۔ "دیکھو بچے ہم کنگال ہیں۔ ہم میں بدلہ لینے کی سکت نہیں۔" پھر اس نے مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اس کتیا کی خاطر میں اپنا بچہ پھانسی لگوا دوں۔ مجھے کون دانا کہے گا۔ میرا مالک سب کچھ دیکھ رہا ہے وہی بدلہ لے گا۔"

اسی اثنا میں جمّا بھی باہر سے آ گیا۔ اس کے کندھے پر پنجالی تھی۔ وہ ابھی ابھی کھیت جوت کر آ رہا تھا۔ اس نے پنجالی پھینک دی اور ایک ہی نظر میں سارا معاملہ بھانپ لیا۔ وہ مجمع سے بچتا ہوا چھپر کی جانب چلا گیا۔ جہاں اس کی بیوی منہ سر ڈھانپے چرخے کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ چپ چاپ، گھڑونچی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کا ایک ہاتھ گھڑے کے ڈھکنے پر تھا اور دوسرا اپنے کولھے پر۔ وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو اس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ ابھی وہ عورتوں کی مکاری کی داستانیں بیان کر رہے تھے۔ اب وہ گڑ کے بھاؤ پر قیاس دوڑا رہے تھے۔ لیکن جمّا کے کان بند تھے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا گویا اندر سے کوئی چلّا رہا ہے۔ جو اس کے

گلے میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ اضطراب سے اس کے ہاتھ تھرتھرائے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے دیوار کے ساتھ نمک مرچ کوٹنے والا ڈنڈا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ کپکپایا۔ اس کے بعد وہ نہیں جانتا کہ کیا ہوا۔ صرف اتنا اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی چولھے کے سامنے پٹڑے کی طرح دراز پڑی چلّا رہی تھی۔

لوگوں نے جلدی سے جمّا کو تھام لیا۔ مگر اس کے ہاتھ سے ڈنڈا تو پہلے ہی گر چکا تھا۔ لوگوں کے پیچھے اس کا باپ چلّاتا آ رہا تھا: "لوگو۔ میرا گھر لٹ گیا۔ یا اللہ! جس نے میرا گھر اجاڑا، اس کا گھر تو اجاڑ۔" وہ بار بار یہی پکار رہا تھا۔ اس کا سارا جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔

دوسرے روز رات کو نمبردار کے ہاں گاؤں کی پنچایت منعقد ہوئی۔ عظیم کا کہنا ٹھیک نکلا۔ بہادر جس مدد اور ہمدردی کی توقع نمبردار سے کرتا تھا۔ وہ دیکھنے میں نہ آئی۔ بہادر کا راجپوتی خون کھولنے لگا۔ جونہی اس نے عیّاں دائیں کو بیٹھک میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ لگا ہی جھکائے داخل ہوا اور سب سے الگ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ نمبردار نے بہتیرا کہا "میر شفیع قریب آ جاؤ۔" مگر اس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا: "نمبردار جی، میری اب وہ شان نہیں رہی کہ میں آپ کے قریب ہو کر بیٹھوں۔"

"میر شفیع تم جانتے ہو کس قدر برا واقعہ ہے۔" نمبردار نے آخر کار تقریر شروع کی۔ نمبردار کی کوٹھڑی آدمیوں سے بھری ہوئی تھی۔ باہر بیٹھنے کو جگہ نہ تھی۔ کیونکہ رات کی بارش سے سارا صحن دلدل ہو رہا تھا۔ جانوروں کے گھر کیچڑ سے چپک رہے تھے اور کیچڑ اور پیشاب

کی آمیزش سے فضا میں گھٹن اور بو پیدا ہو رہی تھی۔ اس پر تمباکو کا دھواں مستزاد۔

مہر غلام محمد بھی اس پنچایت میں موجود تھا۔ وہ شفیع کا رشتہ دار تھا۔ سالم مربع کا مالک تھا گھر میں تین بیٹے اور دو جوٹیں اور چار بچھڑے تھے۔ پچھلی منڈی مویشیاں پر اسے ایک ایک بچھڑے کا پانسو روپیہ ملتا تھا لیکن اس نے بچھڑے بیچے نہیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ مزید دو بیل بنا کر اور مربع بٹائی پر حاصل کرے۔

مہر شفیع نے رونی آواز نکالی اور کہا۔ "بہادر میں تیرا دین دار ہوں۔ چاہو تو سر بازار جوتے لگا لو۔"

لیکن بہادر نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بہادر تھا بھی راجپوت اور اس کی مونچھوں کی قطع وضع بھی راجپوتی تھی۔ اس کی بلوریں آنکھوں میں چقماق کی سی چمک پیدا ہو گئی۔ اس کے سلے ہوئے لب کھلے۔ لیکن کوئی لفظ ان میں سے نہ نکلا۔

مہر غلام محمد نے حقہ کی نے اپنے قریب بیٹھنے والے کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"نمبر دار جی سچ پوچھئے تو قیامت ہے جب دنیا کی طرف نگاہ اٹھتی ہے۔ تو نہ لڑکی پاک ہے نہ لڑکا۔ ٹوبے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ بہادر کے حال کو دیکھئے تو وہ پھوڑے کی طرح پکا ہوا ہے اور مہر شفیع کے دل سے پوچھئے تو وہ رو رہا ہے۔"

اس کی بات نمبردار بھی سمجھ گیا اور بہادر بھی اور گاؤں کے دوسرے لوگ بھی۔ دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے دو آدمی اٹھ کھڑے ہوئے لیکن نمبردار چپ رہا۔ وہ فیصلہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ فیصلے کا رخ موڑنا چاہتا تھا۔

ہجوم میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ کوئی اپنی بات سے مظلوم کا پہلو واضح کر رہا تھا اور کوئی معاملے

کی نوعیت نکھار کر سامنے رکھنا چاہتا تھا کسی نے یوں مثال بھی پیش کی۔ "ایک سوئی لے لو۔ اس کے ناکے میں دھاگا داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ سوئی سیدھی نہ رہے۔"

ہر شخص اس معاملے کو پہلے ہی سے سمجھتا تھا لیکن اس مجموعی فہم نے انہیں زیادہ وسعت نظر دیدی۔ بہادر بھی چپ تھا اور شفیع بھی۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور ابھی تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اب گفتگو پہلوؤں کی طرف ہو لی۔ نمبردار کی بیٹھک میں لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بن گئیں جو آپس میں مختلف عنوانوں پر بحث کر رہی تھیں۔ پھر جماہیاں آنے لگیں اور نیند رات کی طرح منڈلانے لگی۔ لوگ ایک ایک کر کے جانے لگے آدھی رات کے قریب جب ایک پانی کاٹنے والا نمبردار سے وقت پوچھ کر گیا۔ تو نمبردار نے مہر غلام محمد کو اپنے زیادہ قریب بٹھا لیا۔ اس وقت کوٹھڑی میں صرف پانچ آدمی رہ گئے تھے۔

نمبردار نے بالآخر کہا: "میرا خیال ہے کہ مہر شفیع عنایت کو چند دنوں کے لئے گاؤں سے باہر بھیج دے۔ یہ معاملہ صرف اسی صورت میں رفع دفع ہو سکتا ہے۔"

مہر غلام نے سر جھکا لیا۔ "جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

"مہر جی میری سمجھ میں تو یہی بات آتی ہے" نمبردار نے دبی زبان سے کہا۔ "لڑکی بھی تو ویسی مجرم ہے۔"

مہر شفیع نے ان کی طرف کنکھیوں دیکھا اور مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ بہادر چپ چاپ حقہ پی رہا تھا جب فیصلہ ہو چکا تو نمبردار نے بہادر کی پیٹھ تھپکی دیتے ہوئے کہا: "بڈھے صبر کر، وہ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔"

لیکن تقدیر ایک اور کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔ اور اس کھیل کے لیئے سولہ دن بعد میدان تیار
ہوا۔ جب گاؤں کے باہر کبڈی کے مقابلے کے لیئے ایک جتے ہوئے کھیت میں پالا بنایا گیا
کوئیں کے پار اور آر والوں کا مقابلہ تھا۔ گاؤں کے لڑکے بالے خوشی سے کودنے لگے دوپہر ڈھلتے
ہی ڈھول بجنا شروع ہو گیا اور گاؤں کے لوگ کام سے فارغ ہو ہو کر جمع ہونے لگے۔ پرانے خلیفے
پنچ بن گئے اور انہوں نے اپنے اپنے "پٹھوں" کو ترتیب دینا شروع کر دیا۔ کوئی ڈنڑ پیل
رہا تھا تو کوئی بیٹھک لگا رہا تھا۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں جوانوں کے دھوپ میں جلے ہوئے
جسم سنہری ہو گئے۔ کھیل شروع ہوا۔ پہلے وہ لڑکے میدان میں آئے جو ابھی ناپختہ کار تھے۔ ان کے
بعد بڑے جوڑے میدان میں نکلنے شروع ہوئے۔ کوئیں کے پار والوں کا پلہ اب تک بھاری تھا۔
لیکن بعض یار لوگوں کی امیدیں منگو سے لگی تھیں۔ وہ سب سے بلند قامت تھا۔ اس کی مونچھیں پتلی اور
بھوری تھیں۔ وہ کبڈی کا اول درجے کا کھلاڑی تھا۔ پچھلے سال اس نے گنوں کے ایک گٹھے کو
دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر پھینک دیا تھا اس کا گھٹیلا جسم اب چھریرا نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے گھٹنے پر
ہاتھ رکھے جھکا ہوا لڑنے والی جوڑی کے داؤں پیچ بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے تاڑ لیا کہ پار والوں کے
ہاں سب سے بڑے جوان صرف دو ہی ہیں۔ رحمت اللہ اور عزیز۔ رحمت کو تو وہ بخوبی پچھاڑ لیگا لیکن عزیز
سے ذرا مقابلہ ہوگا۔ عزیز مہر غلام محمد کا لڑکا تھا اور عنایت کا یار غار۔ گھر کی بھینسوں کا دودھ اس کیلیئے
وقف تھا۔ اس کا کام صرف کھانا پینا...... تھا لیکن منگو غریب غموں کا مارا ہوا۔ تین ماہ
سے کچھ دن اوپر ہو گئے ان کی بھینس کو خشک ہوئے لیکن ابھی تک وہ کوئی شیردار مویشی نہیں لے سکے۔
پار والوں نے جب رحمت کو نکالا تو آر والوں نے منگو کو دھکیل دیا۔ رحمت "کبڈی کبڈی"

رٹا ان کے پالے میں داخل ہوا منگو نے آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہا لیکن جب اُس نے تھپڑ مار کر بھاگنے کی کوشش کی تو منگو نے اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگیں اُلجھا کر قینچی باندھ دی۔ بجرت کبڈی کبڈی چلا رہا تھا اور اس کا دم پھول چکا تھا۔ اب آر والوں نے نکلنا تھا۔ اُنہوں نے منگو کو نکالا۔ اس نے یا علی کا نعرہ لگایا اور میدان میں کود پڑا۔ سارے کھلاڑی پیچھے ہٹ گئے۔ عزیز بڑھا اس کا سینہ تھل تھل کر رہا تھا اُس نے بڑھ کر منگو کو کلائی سے پکڑ لیا لیکن منگو نے پھرتی سے ایسا جل دیا کہ کلائی عزیز کے ہاتھ سے نکل گئی۔ عزیز خار کھا کر غصیلے بیل کی طرح بڑھا اور منگو کو کمر سے لیکر زمین پر ٹپک دیا۔

"مجھ کو عنایت مت سمجھنا" عزیز نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"یہ بات ہے" منگو نے یک لخت کبڈی کبڈی رٹنا بند کر دیا۔ لوگوں نے سمجھا دم ٹوٹ گیا ہے۔ عزیز نے گرفت ڈھیلی کر دی لیکن جیسے ہی وہ پیچھے ہٹا منگو بجلی کی طرح کوندا اور چشم زدن میں اس زناٹے کا مکا اس کی کنپٹی پر دیا کہ وہ چکری کھاتا ہوا دور جا گرا۔ ہجوم کیا ہوا، کیا ہوا پکارتا آگے بڑھا۔ سارے میدان میں کھلبلی مچ گئی۔ منگو مغلظ گالیاں نکال رہا تھا۔ مہر شفیع جو تماشائیوں میں موجود تھا منگو کی طرف تیزی سے آیا اور جوتی اتار کر اُس کے سر پر ٹپے ماری منگو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ شفیع کے ناک پر ایک ایسا مکا رسید کیا کہ اُس کی نگاہوں میں دُنیا گھوم گئی۔ وہ چکر کھا کر گر پڑا۔ اور اس کا قمیص لہو سے سُرخ ہو گیا۔

اب پورا میدان میدانِ کارزار بن گیا تھا۔ گاؤں سے لاٹھیاں نکلتی نظر آنے لگیں کسی نے منگو کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور کھینچتے کھینچتے ہجوم سے باہر لے گیا۔ یہ عظیم تھا۔ دونوں بچتے بچاتے اکھ کی آڑ لیتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔

گھر پہنچ کر عظیم نے منگو کو مشورہ دیا "تم ابھی یہاں سے کھسک جاؤ۔"

"نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ ارائیوں کا حوصلہ میرا دیکھا بھالا ہے۔" منگو نے جواب دیا۔

"پھر باہر مت نکلنا۔"

اتنے میں بہادر بھی احاطے میں آ گیا۔ اس کے بال مٹی میں اٹے ہوئے تھے اور پگڑی اس کے گلے میں پھندے کی طرح ٹنگی ہوئی تھی۔

"سور کے تخم" وہ آتے ہی دردناک آواز میں چلایا۔ "مجھے چین سے مرنے دو گے یا نہیں۔" منگو نے باپ کی طرف دیکھا لیکن عظیم نے اٹھ کر بڈھے کو تھام لیا اور اسے ایک طرف لیجا کر چارپائی پر بٹھا دیا۔ اور منگو کو اٹھا کر اندر کوٹھڑی میں بند کر کے باہر سے زنجیر چڑھا دی۔ بڈھا بدستور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔

دوسرے دن رمّو کا یکہ کوئیں کے پاس کھڑا تھا۔ اس پر مہر غلام، مہر شفیع اور عزیز سوار تھے۔ عزیز کے سر پہ بھاری کپڑے لپٹے ہوئے تھا اور مہر غلام نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ نمبردار کوئیں کی مینڈھ پر کھڑا ایک شخص سے باتیں کر رہا تھا۔

مسجد کے دائیں پہلو سے بہادر، رمضان اور مستری چراغ کے ساتھ نکلا۔ یکہ دیکھ کر وہ اور رمضان وہیں مسجد کے سایہ میں بیٹھ گئے اور مستری چراغ نمبردار کے پاس آ گیا۔ نمبردار نے اسے آنکھ کے اشارے سے مہر غلام کے پاس جانے کو کہا۔

"مہر غلام" مستری چراغ نے یکے کے پائدان پر پیر رکھتے ہوئے کہا۔ "یکے سے اتر آؤ۔"

"مستری چراغ تمہارا کہنا سر آنکھوں پر لیکن اب کی بار مجھ کو مجبور نہ کرو۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ پرچہ ضرور چاک کروا کے رہوں گا۔"

"بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔" مستری نے پھر کہا۔

اس کے جواب میں مہر شفیع بلپٹا۔ اس کی ناک سوج کر بینگن ہو گئی تھی۔ "پہلے پہل میں یہ سمجھتا تھا کہ میرا لڑکا قصوروار ہے لیکن اب میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بہادر کا سارا خاندان گندا ہے۔ گندے انڈے ہیں وہ سب۔"

بہادر اور رمضان بھی آہستہ آہستہ یکے کی طرف آ رہے تھے ان کے ساتھ کریم دو کاندار بھی تھا۔

بہادر نے پکار کر کہا۔ "شفیع کا خاندان اپنے کارناموں سے دنیا میں مشہور رہے۔"

"تمہاری طرح نہیں بے غیرت۔" شفیع نے جواباً کہا۔

"شرم کرو بڈھو۔" نمبردار پکارا۔ لیکن بہادر کا طیش زنجیریں تڑوا چکا تھا "شرم نہیں آتی تمہیں بڈھے سفید بالوں کے ہوتے ہوئے ایسی بے حیائی! تجھے چاہیئے تھا بُرے کا منہ کالا کرنا لیکن تو اُلٹا اپنے منہ پر کالک مل رہا ہے لعنت ہو تجھ پر۔"

مستری چراغ نے بڑھ کر بہادر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ادھر عزیز نے سر پھیرا اور اُٹھنے لگا "مجھے مرنے دو" لیکن مہر غلام نے اسے زبردستی بٹھا دیا۔ اِدھر اُدھر سے لوگ جمع ہونے لگے اور صلح صفائی کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں رنو بھی سر پر چارے کا گٹھا اٹھائے آ گیا "بھائی جلدی کرو، مجھ کو دیر ہو رہی ہے۔" اس نے گھوڑا ہانک دیا اور لوگ پیچھے پیچھے چلنے لگے مستری چراغ نے نمبردار سے کہا۔ "مہر غلام محمد کو کسی صورت روک لیتے تاکہ معاملہ رفع دفع ہو جائے۔"

لیکن نمبردار یہ عذر پیش کرتا رہا کہ جب تک مہر راضی نہ ہو وہ اسے روک نہیں سکتا۔ یکہ چلتے چلتے گاؤں سے باہر آگیا اور لوگوں نے اچانک دیکھا کہ عنایت کپاس کی مینڈھ پر کھڑا تھا۔ بہادر نے مستری چراغ کی طرف دیکھا، مستری چراغ نے رمضان کی طرف، پھر تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

بہادر بولا "اب لوٹو، جو ہونا ہے ہونے دو" اتنا کہہ کر وہ مڑا اور اس کے ساتھ مستری، رمضان اور کریم اور دو ایک اور آدمی لوٹ آئے۔ کچھ یکّے کے ساتھ چلتے گئے۔

دوسرے دن ایک شہری ٹانگہ چھن چھن کرتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا، اس میں سے ایک بلند قامت گندم گوں تھانیدار اترا جس کی وردی کے بٹن تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ انہوں نے سیدھا نمبردار کے مکان کا رخ کیا۔ لوگ راستے سے ہٹ گئے تھانیدار نمبردار کی بیٹھک میں داخل ہو گیا اور سپاہی باہر چارپائی پر بیٹھ گئے ان کے گرد لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ نمبردار ہانپتا کانپتا بیٹھک میں داخل ہوا۔ پھر بھاگا بھاگا باہر آیا "ویرو! بے ویرو" ویرو اس کے پاس ہی کھڑا تھا لیکن نمبردار نے گھبراہٹ میں اسے دیکھا نہیں "صابن تولیہ بھاگ کر لا۔ جلدی، فوراً" اس کے بعد وہ پھر ہانپتا کانپتا اندر چلا گیا۔

نمبردار کے گھر میں برتنوں کی کھنکھناہٹ بلند ہو گئی اور آنے جانے والی عورتوں کا تانتا بندھ گیا۔ اتنے میں ویرو ایک مرغے کو ٹانگ سے پکڑ لایا۔ مرغا اس درد سے چلا رہا تھا گویا کہ وہ کہہ رہا ہو "خدا کے واسطے مجھے تھانیدار کے سامنے نہ لے جانا، خدا کے واسطے" لیکن اس نے اسے زمین پر ٹیک دیا اور جیب سے چاقو نکال اس کی گردن پر پھیر دیا۔ جب چاقو چل چکا تو ویرو نے پڑھا بسم اللہ اللہ اکبر

خون کی تپلی سی دھاری اُڑی اور مُرغے کی آنکھوں پر سفیدی تن گئی۔

نمبردار کم از کم سو مرتبہ کمرے سے باہر نکلا اور اندر داخل ہوا ہوگا۔ اسے اس وقت سکون ملا جب تھانیدار صاحب تھوڑی دیر کے لئے آرام فرمانے کے لئے سو گئے۔ اس وقفہ میں نمبردار نے ملزمان کو بلوا لیا۔ ملزمان میں بہادر، جمّا اور منگو کا نام تھا۔

بہادر کولہو میں گنے لگا رہا تھا۔ جمّا کھالا کھود رہا تھا۔ اور منگو کڑاہے سے رب نکال کر چاک میں ڈال رہا تھا کہ چوکیدار پہنچ گیا۔ اس نے منگو کو گڑ کی بھیلیاں تک بنانے کی اجازت نہ دی۔ کہ اُسے بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا "جلدی چل تھانیدار بلا رہا ہے"۔ منگو کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔

"بھائی نواب ٹھہر و تو۔"

لیکن نواب کی نیلگوں آنکھیں مصر تھیں کہ حکمِ حاکم کی فوراً تعمیل ہونی چاہئیے۔

بہادر نے بیلوں کو پنجالی سے جدا کیا اور چرنی کے ساتھ باندھ دیا۔ جمّا نے ہاتھ سے پھاوڑا رکھ دیا اور تینوں چوکیدار کے ساتھ ہو لئے۔

تھانیدار اس وقت سو یا ہوا تھا۔ تینوں سپاہیوں کی چارپائیوں کے پاس دیوار سے لگ کر بیٹھ رہے۔ سپاہی جہلمی تھے۔ ان کی مونچھوں کے بال تیل سے چمک رہے تھے۔ ایک سپاہی لیٹ گیا۔ "او جانور! تیرا نام کیا ہے؟" اس نے جمّا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ادھر آ میرے پیر دبا"۔۔۔ دوسرے نے اپنی جیب سے چھوٹا سا آئینہ نکال لیا اور اپنا چہرہ پھرا پھرا گھما گھما کر دیکھنے لگا۔

جب دوپہر ڈھل چکی تو وہ تھانیدار کے کمرے سے نکلا اور صابن اور تولیہ لے کر پھر اندر چلا گیا۔ "شاہ صاحب جاگ گئے ہیں"۔ لیٹے ہوئے سپاہی نے دوسرے سے پوچھا۔

"بس ابھی جاگے ہیں۔"

منگو کا دل پھڑ پھڑانے لگا۔ منگو نے اپنے گلے سے تھوک نیچے اتارنا چاہی لیکن گلا سوکھ چکا تھا۔ ویرو کے اندر داخل ہو جانے کے بعد صحن میں پھر خاموشی چھا گئی۔ اندر سے غرائے اور کلیاں کرنے کی آواز آنے لگی منگو کا سر جھک گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن اس کے کانوں میں ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھی۔

اب نمبردار بھی اندر چلا گیا۔ اس کے بعد پھر غلام کی حاضری ہوئی اور پھر شفیع بھی آکر سپاہیوں کے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سڑک پر گزرنے والے چند منٹ کیلئے کھڑے ہو کر دور سے سپاہیوں اور ملزموں کو دیکھ لیتے اور چل دیتے۔ بہادر اور جما چپ چاپ بیٹھے تھے کبھی کبھار بہادر لمبی آہ بھر کر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا گویا وہ بادلوں کے کسی نشان کو ڈھونڈ رہا ہو۔ آسمان پر سورج کی تیز سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ جب ویرو اس کے پاس سے ایک ڈھکا ہوا طشت لیکر گزرا، تو بہادر نے ایک سپاہی سے پوچھا۔ "چودھری صاحب مجھے پیشاب کرنے کی اجازت ہے۔"

"نہیں۔"

بہادر پھر بیٹھ گیا اور تنکے سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگا۔

تھانیدار کے کمرے سے زور سے کھنکارنے کی آواز آئی اس کے بعد نمبردار باہر نکلا اور اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا دونوں جلدی سے اٹھے اور اپنے چپل گھسیٹتے اور تہمد کے پلو اڑسے بیٹھک کی طرف بڑھے۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں کھٹ پٹ کی آوازیں پیدا ہوتی رہیں۔ پھر ایک سپاہی دروازے میں نمودار ہوا اور منگو کو پکارا۔

منگو نے یخ بستہ نگاہوں سے سپاہی کی طرف دیکھا جو دروازے کی چق اٹھائے کھڑا تھا۔ بہادر اٹھ کر منگو کے ساتھ اندر جانے لگا۔ لیکن سپاہی نے پکار کر کہا "بڈھے تجھے نہیں" بڈھا پھر بیٹھ گیا۔ اس نے دھڑکتے دل سے اپنے بچے کو کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ اب وہ اور جبار گئے تھے۔

تھانیدار تین تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے بنیان پہنی ہوئی تھی اور اس کے سیاہ نوکیلے بال ماتھے پر پریشان حالت میں گر رہے تھے۔ وہ گندم گوں تھا لیکن اس کی بلوریں آنکھیں اس طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ جیسے اس نے کوئی نشہ پیا ہو۔

"ہوں" تھانیدار نے نمبردار کا اجلا تولیہ اپنی سیاہ گردن پر پھیرتے ہوئے کہا۔ جبر غلام نیچے چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے پاس نمبردار بھی چار زانو بیٹھا تھا۔

"جلال" تھانیدار نے دھیمی آواز میں کہا "کر دو چھاڑ دو۔"

منگو کا دل دھک سے ڈوب گیا جی کڑا کرنے کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ اسکی ٹانگوں میں سکت بالکل ختم ہو چکی تھی، اس کے گلے میں ایک گولا سا اٹک گیا۔ اس نے اپنی پوری قوت لگا کر اپنے گلے سے دو مرے ہوئے الفاظ نکالے "میرا قصور"

"تیرا قصور" تھانیدار یکا یک کڑکا اور اس کے ساتھ پورا کمرہ کانپ اٹھا "حرامزادے دس نمبریے بدمعاش"۔ اس کے بعد اس نے مشین گن کی طرح تجربہ اور ٹھلو ر سے حاصل شدہ مغلظ گالیاں تڑاتڑ بوسانی شروع کر دیں چشم زدن میں جلال نے اسے دھکا دیکر گرا دیا۔ منگو دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے گویا وہ ڈوب رہا ہے۔

"سوٗر کے چوٹ ننگیے کر دو۔"

اس کے بعد ایک چیخ گولی کی طرح کمرے سے نکلی اور تمام گاؤں میں پھیل گئی۔ نمبردار کے احاطے کے گرد تمام گاؤں جمع ہو گیا تھا۔ ہر ایک کا دل اس طرح ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ گویا وہ دھیمی آگ پر بھنا جا رہا ہو۔ کمرے کے روشن دان میں سے تڑاتڑ کی آواز آ رہی تھی جب تڑاتڑ ختم ہو جاتی تو ایک کراہ جیسے کسی کا پکا ہوا پھوڑا اچھل جائے۔ رندھی ہوئی چیزوں میں الجھ کر رہ جاتی۔

بہادر جلدی سے دل پر ہاتھ رکھے اٹھا اور احاطہ کے دروازے سے نکلتے ہی سڑک پر گر گیا۔ وہ پھر اٹھا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

"عظیم آج مجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ پاؤں ہی نہیں اٹھتا۔"

عظیم نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور اسے سہارا دیکر اٹھایا۔

وہ لنگڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس کی بہو کھاٹ پر پڑی سسک رہی تھی۔

"عمری" بہادر پکارا اور اس نے اپنی پگڑی سر سے اتار کر اس کے پاؤں میں رکھ دی۔ "تم میرے بچے کو بچا سکتی ہو!"

عمری تڑپ کر اٹھ بیٹھی، اس نے اپنے سسر کی پگڑی اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دی۔

"چچا" مجھ پاپن کو اور کیوں گنہگار بناتے ہو؟ بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں؟

"اگر تم اپنا کوئی زیور خدا کے واسطے دان کر سکتی ہو تو میرے بچے کو بچا لو۔"

عمری اُٹھی اور اندر سے ایک بقچہ اٹھا لائی۔ اس نے بقچہ اس کے قدموں پر رکھ دیا۔

"یہ لو، یہ تم پر حلال اور مجھ پر حرام۔"

بہادر نے بقچہ کھول کر اس میں سے جھومر نکالا اور عظیم کی ہتھیلی پر رکھ دیا "عظیم تم میرے بچے ہو۔ مجھ پر کرم کرو۔ نمبردار کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ بہادر کے گھر کا کل اثاثہ یہی کچھ ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے بقچہ اُلٹ دیا۔ اُس میں سے مٹی گری۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد کچھ آدمی منگو کو اٹھائے بہادر کے صحن میں آ گئے۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور وہ اِس طرح کراہ رہا تھا گویا وہ میدانِ جنگ میں زخمی ہو گیا ہے۔ جب اُسے چارپائی پر لٹایا گیا۔ تو اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ چت لیٹ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ چارپائی پر توشک بچھا کر اسے منہ کے بل لٹایا گیا۔ وہ اپنے ہوش قریب قریب کھو چکا تھا۔ جب اس کے مُنہ میں دودھ ٹپکایا گیا تو اس نے وہ بھی تھوک دیا۔

دیکھنے والوں کا جمِ غفیر لگ گیا۔ عورتیں کراہت آمیز منظر دیکھنے کے لئے ٹوٹ رہی تھیں وہ دیکھتیں...... اور تکلیف کا بھرپور احساس لے کر لوٹ جاتیں اور ہاتھ ملتی ہوئی کہتیں۔ "توبہ بہن توبہ۔ ظلم سا ظلم، اس ظالم ارائیں کو موت بھی نہیں آتی۔"

جب شام کی اذان ہو چکی تو منگو سو گیا۔ بڈھا اس کے اوپر جھک گیا۔ منگو کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس کی گھنی بھنویں، ستواں ناک اور سیلے ہوئے ہونٹ مجھ سے بال بھنا بھنا بڈھے نے محسوس کیا گویا یہ اسی کا چہرہ تھا جو کرب بھری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ جا اس کے

بالیں بیٹھ کر پنکھا کرنے لگا۔ بہادر، اُٹھ کر صحن میں آگیا۔

صحن کے اوپر کھلا آسمان ننھے منے جگنوؤں سے معمور تھا۔ باغ سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تیرتے ہوئے آئے اور ایک بیل کی گھنٹی ٹنٹنانے لگی۔ بوڑھے نے چھپر کی پھوس ٹٹولتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے سلے ہوئے ہونٹ نیم وا ہو کر کپکپائے۔ اتنے میں قریب سے کسی کے آنے کی آواز آئی ایک آدمی چادر کی بکل مارے اس کی طرف آ رہا تھا۔

"کون؟"

"میں احمد ہوں تمہیں چودھری صاحب طلب کر رہے ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر تک منگو کا حال احوال پوچھتا رہا۔ وہ زمین کے مالک کا بیگاری تھا جب وہ چلا گیا تو بہادر نے جما کو چودھری کے پاس بھیج دیا اور خود منگو کو پنکھا کرنے لگا۔

چودھری کرم علی اپنے مکان کے آگے پلنگ پر تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اس کے سامنے زمین پر رحیم مزارعہ ان کا حقہ پکڑے بیٹھا تھا۔ پاس ایک میز پڑی تھی جس پہ مدھم لالٹین جل رہی تھی۔ جما بھی سلام کر کے ایک طرف زمین پر بیٹھ گیا۔

"کیوں بھائی جما کیا حال ہے منگو کا؟" چودھری صاحب نے حقے کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"بس بچ گیا ہے جناب۔"

اس کے بعد چودھری صاحب نے چند الفاظ میں پولیس کی مذمت کی اور مہر شفیع اور مہر غلام کے ظلم پر نفرین کی جب یہ موضوع ختم ہوا تو انہوں نے اپنے تکیے کے نیچے سے

ایک رجسٹر نکالا اور اُسے کھولتے ہوئے بولے: "آج چوکیدار پھر آیا تھا اور تاکید کر گیا ہے کہ پرسوں تک معاملہ ضرور داخل خزانہ ہو جائے۔ سب مزارعوں نے اپنا اپنا حساب چکا دیا ہے۔ صرف تم ہی رہ گئے ہو۔ تمہارے ذمے جو حساب ہے وہ سُن لو۔ تم ذرا جلدی سے اس کا بندوبست کر دو۔"

چودھری صاحب نے لالٹین کی بتی اونچی کر دی، اور ایک چاندی کے فریم کی عینک آنکھوں پر لگا کر بلند آواز سے پڑھنے لگے۔

"ستو بھائی، مالکانہ خرچ ڈھائی سیر فی من کے حساب سے کل گڑ کا ساڑھے گیارہ من بنتا ہے اور کپاس کا سات من بائیس سیر۔ اگر تم مالکانہ اور خرچ، جنس کی صورت میں ادا نہ کر سکو، تو اس کے حساب سے رقم دے دو۔

۸ کنال ٹک چری در چالیس روپے فی کنال	=	۳۲۰—۰—۰
معاملہ حصہ نصف	=	۷۵—۰—۰
ملبہ	=	۱۴—۰—۰
چوکیدارہ	=	۱—۸—۰
فصلانہ پٹواری	=	۲—۰—۰
میزان	=	۴۱۲—۱۵—۰

تمہارے ذمہ کل میزان چار سو بارہ روپے پندرہ آنے ہے!